

سلاطین ہند کی دینی و مذہبی مساعی: ایک جائزہ

محمد شیم اختر قاسمی

محمد بن قاسم کی معزولی کے بعد سے لے کر عہد عباسی کے درمیانی عرصے تک سندھ اور اس کے نواحی علاقوں ملتان اور لاہور وغیرہ سے عرب کا تعلق تو ضرور رہا، مگر ان کی طرح تیز رفتاری سے دوسرے امراء فتوحات نہ کر سکے۔ اگر نے آگے بڑھ کر ہندوستان میں عباسی خلفا کا اثر و رسوخ قائم کرنے کی کوشش کی تو اسے صرف وقتی فتح و کام رانی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی زمانے میں خلافت کی کم زوری سے فائدہ اٹھا کر سندھ میں اور اس سے آگے بڑھ کر شمالی ہند کے ساحلی علاقوں سے متصل چند خود مختار ریاستوں کا وجود عمل میں آیا، جن کے حکم راں عرب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر خلافت بغداد سے ان کا تعلق برائے نام ہی تھا۔ ان حکومتوں کے قیام سے یہ فائدہ ہوا کہ یہاں سے مسلمانوں کا تعلق بالکل منقطع نہ ہو سکا۔ اس لیے درہ خیبر کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہونے والے ہجی فرماں رواؤں کو یہاں ایک سجاجیا گلتاں ملا اور ابتدائی لڑائی بھرائی کے بعد جلد ہی انہوں نے یہاں اپنے قدم جمایے۔ اس جگہ یہ وضاحت بھی غیر ضروری نہ ہوگی کہ سلاطین ہند بہ نفس نفس یا بہ راہ راست یہاں اسلام کی اشاعت کے لیے فکر مند نہ تھے۔ البتہ ان کے رویے سے بڑی حد تک اشاعت اسلام کی راہ ہم وار ہوئی۔ اسی تناظر میں ہم ان کی دینی، مذہبی اور علمی مساعی کا جائزہ لیں گے۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام کے اساب

جس زمانے میں امیر سبکنگین نے ہندوستان پر حملہ کیا، اس وقت یہاں کے علاقے پنجاب، کابل، اور پشاور کا حکم ران راجہ بے پال تھا، جو طاقت ور، بڑے رعب اور دبدبے والا تھا۔ ادھر ملتان میں شیعہ قرمطی نے اپنی شہنشاہیت کا ڈنکا بجا رکھا تھا۔ جب کہ تیسری طرف ایک مسلم حکومت بخارا کی تھی، جو اپنا دم توڑ چکی تھی، جس کا ایک فہیم و زیرک امیر اللشگین خراسان کا عامل تھا۔ جب ۵۳۰ھ /

۹۶۱ء میں ابوالفوارس عبد الملک بن نوح سامانی کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا تو تخت بخارا کی مند نشین کے سلسلے میں تمام امرا سے راءے طلب کی گئی۔ اپنگین کی تجویز اس وقت بخارا پہنچی جب کہ ابو صالح منصور بن نوح سامانی کو تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق اپنگین نے کہا تھا کہ ابو صالح کے بجائے اس کے چچا کو تخت پر بیٹھایا جائے، کیوں کہ وہ ابھی کم عمر اور ناجربہ کار ہے۔ اس تجویز سے ابو صالح کے دل میں اپنگین کے خلاف کدورت بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی سرزنش کرتا، اپنگین اپنی خود مختاری کا اعلان کر کے غزنیں اور کابل پر قابض ہو گیا۔ اس طرح غزنیں کی حکومت حاکم بخارا سے الگ ہو گئی۔ لگ بھگ پندرہ سال تک اپنگین غزنیں اور کابل کا حکم ران رہا۔ ۵۳۶ھ / ۹۷۴ء میں اس کا انتقال ہو گیا تو یہے بعد دیگرے غزنیں کے تخت پر دو حکم ران جلوہ افروز ہوئے۔ مگر دوچار سالوں میں یہ اپنی موت مر گئے۔

۹۷۷ھ / ۵۳۶ھ میں امیر ناصر الدین سبکنگین کو وگوں نے غزنی کے تخت پر بٹھا دیا۔ تخت نشین کے بعد امیر کو کئی اہم مسائل سے دوچار ہونا پڑا اور اپنے ہم سایہ مسلم فرماں رواؤں سے جنگ کرنی پڑی۔ ایک طرف قرامطہ کی خفیہ سازشوں کا اندیشہ جس کامر کزو محور ملتان تھا، دوسری طرف دیلیسوں کی مخالفت، تیسرا طرف فائق اور ابو علی کے خرخے، چوتھے خود اپنے ہی خاندان کی سلطنت کا بانی اور نیا بادشاہ ہونے کی وجہ سے اندر وطنی بغاوتوں کا خوف۔ یہ وہ دھمکی آمیز طاقت تھی کہ اگر ذرا سا بھی بادشاہ بے خبر ہوتا تو اس کی حکومت کا خاتمه ہو جاتا، چنانچہ اس نے کسی سے جنگ کی تو کسی سے مصالحت تو کسی کو افہام و تفہیم کے ذریعے اپنا ہم خیال بنایا۔

امیر ناصر الدین اپنے ہم سایہ حکم ران سے لڑائی بھرائی کے لیے فوج لے کر غزنی سے روانہ ہوا۔ ادھر غزنیں کی سلطنت کو خالی دیکھ کر پنجاب اور لاہور کا راجہ جے پال غزنی پر حملہ کر کے اسے اپنے مقبوضات میں شامل کرنے کے لیے ایک بھاری فوج لے کر روانہ ہو گیا۔ سبکنگین کو خبر ہوئی تو وہ آندھی کی طرح تیز رفتاری سے اپنی سلطنت کو بچانے کے لیے غزنیں پہنچ گیا، نیز منصوروہ کی بر بادی کے بعد قرامطہ کا زور و شور بڑھ گیا تھا اور وہ پہاڑی قبیلوں میں لاذ بیت کو بڑی تیزی سے پھیلا رہا تھا۔ سامانی سلطنت اور اس کے بعد غزنیوی سلطنت قرامطہ کی سخت دشمن تھی۔ اس نے کوہ سلیمان اور دریائے سندھ کے ساحل تک سامانی فوجیں قرامطہ کے تعاقب میں آتی رہتی تھیں، لہذا پنجاب کے راجہ جے پال کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں میری حدود مملکت میں یہ دست درازی نہ کر دیں۔ اس نے قرامطہ کی اس

کو شش کو کہ اس نے ریاست منصورہ کو برباد کر دیا بڑے اطمینان سے دیکھا اور ملتان کی متعلہ ریاست بھائیہ کے راجہ کو شریک مشورہ کر کے سلطنت غزنی کے مشرقی سرحدی قبائل کے سردار حمید خان لودی لوڈی سے اول ایک معابدہ لکھایا اور پھر اپنی فوج کے ذریعے مدد دے کر ۸۵۳ھ میں حمید خان لودی کے ہاتھوں ملتان کے قریشی عربی خاندان کی حکومت کا خاتمه کرا دیا۔ ایک طرف قریشی خاندان کی حکومت کے خاتمے کی سازش اور قرمطی کے چھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرنا تو دوسری طرف غزنی حکومت کو غالی دیکھ کر راجہ ہے پال کا سلطنت غزنی کو لقمه بنانا، ایسا نا منصفانہ اتدام تھا جسے کوئی سلطنت برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ۹۷۹ء میں دونوں فوج کا سخت مقابلہ لمغان اور غزنی کے درمیانی خطے میں ہوا۔ مسلم افواج کے حملے کی تاب نہ لا کر راجا نے مجبوراً صلح کی پیش کش کر دی۔ راجہ اپنے ملک لوٹنے کے بعد نہ صرف وعدہ خلافی کا مرتکب ہوا، بلکہ ہندوستان کے دوسرے راجاؤں مہاراجاؤں سے استمداد کی عرضی پہنچ کر سبکنگین سے دوبارہ جنگ کرنے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ دوبارہ بھاری فوج لے کر امیر سے جنگ کرنے کے لیے لمغان کے مقام پر پہنچ گیا۔ ناصر الدین کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جسے پال کا فیصلہ کن مقابلہ کرے اور اس کا صفائی کر دے۔ چنانچہ ناصر الدین اپنی فوج لے کر جائے واردات پر پہنچا اور مقابل فوج پر ٹوٹ پڑا۔ دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ سبکنگین نے دشمن کا دور دور تک تعاقب کیا۔ اس علاقے کی گنگرانی اور دیکھ بھال کے لیے اپنے آدمیوں کو مامور کر کے غزنین کی راہ لی، جہاں اس کا ۸۳۸ھ / ۹۹۷ء میں انتقال ہو گیا۔

محمود غزنوی کے دفاعی حملے اور اس کا پس منظر

امیر سبکنگین کے انتقال کے وقت باپ کے ہم راہ محمود غزنوی کا سوتیلا بھائی اسماعیل حاکم خراسان تھا۔ جب کہ محمود غزنوی بخارا کی مہم سر کرنے میں مصروف تھا۔ مصلحت کے پیش نظر ناصر الدین نے اسماعیل کو تخت سلطانی پر بٹھا دیا، جس کی خبر محمود کو ہوئی تو وہ رنجیدہ خاطر ہوا اور بڑے ادب و احترام اور پیار و محبت سے بھائی کو خط لکھا کہ ابھی تم کم عمر اور ناتجربہ کار ہو، اس لیے آبائی تخت میرے حوالے کر دو، میں تم کو خراسان اور بلخ کی امارت بلا شرکت غیر سونپ دوں گا، مگر اس خط کا اسماعیل پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ خود کو ہی نادانی میں سلطنت غزنی کا بے تاج بادشاہ سمجھ بیٹھا، جس کے

نتیجے میں دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ ہوئی اور جیت کا سہرا محمود کے سر بندھا۔ اس طرح وہ ۳۸۸ھ / ۹۹۸ء کو غزنین کا بادشاہ بن گیا اور اپنی بے پناہ قابلیت اور فنون حرب کی واقفیت کی بنا پر یکین الدولہ و امیر الملہ کا خطاب پایا، جو خلیفہ بغداد قادر بالله کی طرف سے دیا گیا تھا۔^(۱)

محمود غزنوی نے بخارا، آذربائیجان اور فارس کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر رکھی تھی کہ کوئی ہم سایہ مسلم حکم ران سلطنت غزنی میں مداخلت نہ کر سکے کہ اچانک محرم ۳۹۱ھ / ۱۰۰۰ء کو اسے خبر ملی کہ راجہ بے پال غزنی پر حملہ کرنے کے لیے بخاری فوج لے کر آ رہا ہے اور دریاۓ سندھ کو عبور کر چکا ہے۔ چنانچہ محمود غزنوی بھی اپنی فوج کے ساتھ مقابلے کے لیے نکلا۔ راجا کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ راجا کے ہم راہ اس کے کئی ساتھی گرفتار کیے گئے۔ انند پال بے پال کا لڑکا فرار ہونے میں کام یاب ہو گیا۔ محمود گرفتار شدہ لوگوں کو اپنے ساتھ غزنی لے گیا۔ آٹھ مہینے کے بعد معافی تلافی ہوئی اور باج گزار رہنے کا وعدہ کیا تو محمود نے سب کو آزاد کر دیا۔ راجہ بے پال لاہور پہنچا۔ انند پال کو جو اس کا بیٹا تھا وصیت کی کہ آئندہ محمود کے خلاف معركہ آرائی نہ کرے اور سالانہ خراج بھیجنے رہے۔ اس کے بعد راجہ بے پال نے اپنے مذہبی عقیدے کے مطابق خود کو جلا کر خاک کر لیا۔^(۲) اس کے بعد بھی یہاں کے ہنود متعدد ہو کر محمود کے خلاف وقتی علم بلند کرتے رہے۔ اس کی تادیب کے لیے محمود غزنوی کو دفاعی کارروائی کرنی پڑی۔ اس طرح اس نے لاہور، پنجاب، بھٹٹا، کشمیر، تھانیسر، قوچ، متحرا، کانجھر، سومناتھ، انہلواڑہ اور اجیمر وغیرہ کے علاقوں پر متعدد بار حملے کیے اور مسلمانوں کے خلاف ابھرتی ہوئی متحده طاقت کو کم زور کرنے میں اس نے اپنی صلاحیت صرف کر دی۔

ہندوستان میں امیر ناصر الدین سبکنگیں اور محمود غزنوی نے متعدد حملے کیے۔ اس کی وجوہات پر منصفانہ نظر ڈالی جائے تو بہ ہر صورت یہ ماننا پڑے گا کہ انھوں نے یہاں حملہ کرنے کی کبھی پیش تدبی نہیں کی۔ دونوں (باپ بیٹے) نے اس وقت ہندوستان پر حملہ کیا جب ایک طرف راجہ بے پال غزنی کی سلطنت کو ہڑپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو دوسری طرف ملتان میں اور اس کے قرب وجوہات کے

۱۔ نظام الدین احمد، طبقات اکبری (کلکتہ، ۱۹۲۷ء)، ۱: ۷۔ اردو دائرۃ معارف اسلامیہ (لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۳ء)، ۲۰: ۲۳؛ اشتیاق احمد قریشی، سلطنت دہلی کا نظم حکومت (کراچی: کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء)، ۲۶۔

۲۔ ابو الحسن ابن الشیر، الكامل فی التاریخ (بیروت، ۱۹۶۵ء)، ۹: ۱۷۰؛ محمد قاسم فرشته، تاریخ فرشته، (دیوبند: کتبہ ملت)، ۱: ۱۰۵۔

علاقوں میں قرمطیوں کو پناہ مل رہی تھی۔ حالانکہ وہ چاہتا تو زمام حکومت سنبھالتے ہی ملتان پر حملہ آور ہوتا اور قرمطیوں کا صفائی کر دیتا اور راجہ جسے پال سے بھی نبرد آزمائی کرتا۔ چوں کہ ہندوستان کے دوسرے راجا اور مہاراجاؤں نے بھی جنگ میں راجہ جسے پال کا ساتھ دیا تھا اور وہ مسلمانوں کو اذیت پہنچانے کے درپے تھے، اس لیے سلطان نے چن چن کر ان لوگوں سے جنگ کی اور ان مفسدوں کو بھی کیفر کردار تک پہنچایا جو سلطان کے خلاف لوگوں کو ورغلاتے اور بھڑکاتے رہتے تھے۔ اپنی شان دار کام یابی کے باوجود نہ تو اس نے کسی کو زبردستی مسلمان بنایا اور نہ مذہبی جنون کے بنا پر بیہاں کے مندوں کو مسماں اور بتوں کو پاش پاش کیا، ڈاکٹر تارا چندر سلطان محمود کے متعلق لکھتے ہیں:

محمود کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح آس پاس کے ملکوں کو فتح کر کے ایک وسیع سلطنت قائم کر لے۔ اس نے اس کوشش میں اپنی تمام زندگی صرف کر دی اور اپنے ارادوں میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ اس نے وسط ایشیا کا براحتہ اور فارس فتح کر لیا اور قریب تھا کہ خلیفہ وقت کی مملکت پر قبضہ کرے کہ ۱۰۳۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے نام و نمود اور مال غنیمت کے خاطر ہندوستان پر بہت سے حملے کیے، بہت سے مندوں کو لوٹا اور جلایا کیوں کہ وہ دولت کے خزانے تھے، لیکن اس نے کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کیا، بلکہ اپنی فوج میں بہت سے ہندو امیر اور سپاہی مقرر کیے جو اس کی طرف سے فارس اور وسط ایشیا کی لڑائیوں میں لڑے۔ اس کا مذہبی تشدد محض ان بدعت پسند مسلمانوں پر تھا جو اس کی سلطنت کے امن و امان اور انتظام میں خلل انداز ہوئے۔^(۲)

محمود غزنوی کی رواداری اور انصاف کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر ایشور ٹوپا لکھتے ہیں:

موجودہ دور کے ایک سورج کا خیال ہے جو محمود غزنوی کا نائد بھی ہے کہ وہ کوئی مبلغ اسلام نہیں تھا، غیر مسلموں کو مسلمان بنانا اس کا مقصد نہیں رہا۔ افسوس نے ہم کو یقین کے ساتھ بتایا ہے کہ سلطان گجرات میں عرصہ دراز تک رہا، لاہور میں اس کا قیام رہا، لیکن اس نے کسی غیر مسلم کو مسلمان نہیں بنایا، اس نے ہندوؤں کو مسلمان بنانے کی فکر نہیں کی، اس کی مذہبی پالیسی میں رواداری کی خصوصیت تھی، اس کے متعلق یہ کہیں ذکر نہیں آتا کہ اس نے کسی ہندو کو اپنا مذہب چھوڑنے پر مجبور کیا، اس نے کسی بھی شخص کو اس کی ذاتی ضمیر کی بنابر موت کی سزا نہیں دی، اس نے لڑائی یا محاصرہ کے موقع پر تو ہندوؤں کو ہلاک کیا، لیکن کسی اور موقع پر اس کے ہندوؤں کے ہلاک کرنے کا ذکر نہیں پایا جاتا ہے، اس کے پورے دور حکومت میں ہندوؤں کو پوری مذہبی آزادی رہی، ان کا تقریر نہ صرف انتظامی امور کے سلسلے میں کیا جاتا، بلکہ وہ فوج میں بھی بحال کیے جاتے، ان کے مذہب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا، جس طرح فوج میں عرب، افغان، دیلمی،

خراسمی اور غوری ہوتے وہ بھی ہوتے۔ ہندو شکری اپنے آتا کی خاطر کرمان، خوارزم اور مرو میں جا کر لڑے۔ غزنیوں کی فوجی مہموں کی تاریخ میں ہندو فوجی سرداروں میں تلک، سوندیرائے اور بچ رائے کے نام نمایاں ہیں، غزنیوں کی حکومت میں ان ہندو فوجی سرداروں کی اعلیٰ حیثیت رہی، وہ بڑے قابل اعتماد سردار سمجھے جاتے، غزنیوں کے ساتھ ان کی وفاداری اور خدمت گزاری مثال کے طور پر پیش کی جاتی۔^(۳)

محمود غزنوی کی رواداری کی ایک بڑی مثال یہ بھی ہے کہ ایک ہندو ملازم نے امیر نصر کا ایک جڑاؤ لگام چوری کر لیا تھا۔ امیر نے حکم دیا کہ اسے بیس کوٹے لگائے جائیں۔ محمود کو اس کی اطلاع ہوئی تو امیر نصر کو کھلا بھجا کہ میری موجودگی میں تم میرے غلاموں کو تازیانے سے پڑواتے ہو اور ہماری ناراضی کی پرواہ نہیں کرتے، اس کے بعد ایک ماہ تک اسے اپنے حضور میں آنے نہیں دیا۔^(۴)

فتوحات بلاد و امصار کے ساتھ سلطان نے کئی ایسے علمی، ثقافتی، اور مذہبی امور انجام دیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر دینی جذبہ ہمیشہ متحرک رہتا تھا۔ وہ جب بھی لڑائی کے میدان میں اترتا تو پہلے خدا کے حضور سر بہ سجود ہوتا اور اپنی کام یابی کی دعا کرتا۔ اس نے اپنے دربار میں نامور علام و فضلا، شاعر اور ادباء کو جمع کر لیا تھا جو اپنے اپنے طور پر دینی و علمی خدمات انجام دینے میں مصروف تھے۔ الیرونی نے اس کے دامن میں پناہ لی اور علمی جواہرات کے ایسے نمونے پیش کیے جن سے دنیا آج تک مستفیض ہو رہی ہے۔ سلطان نے غزنی میں جو مسجد تعمیر کروائی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تعلیم کے لیے بھی اس نے بڑے بڑے مدارس و مکاتب قائم کروائے اور علام کی سرپرستی کی۔ علم و ادب نے اس عہد میں جو عروج حاصل کیا وہ تاریخِ وادیات کا اہم باب بن گیا۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

سلطان محمود نے نہ صرف فتحِ ممالک اور جمعِ اموال میں کمال حاصل کیا، بلکہ علم و ادب کی بھی سرپرستی کی اور اپنے دربار میں زمانہ بھر کے منتخب شاعر اور علام و فضلا جمع کر دیے۔ واقعہ یہ ہے کہ برگزیدہ شعراء کا جو جمگھٹا محمود کے دربار میں تھا، ایران، توران کے کسی دوسرے فرمان روکو میسر نہیں ہوا۔ ان شعراء کی بذلہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں نے محمود کی فتوحات کو چارچاند لگا دیے اور نہ صرف سیاسی تاریخ میں بلکہ فارسی

—۳— سید صباح الدین عبدالرحمن، ”ہندوستان کے عہد میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری“، معارف، عظیم گڑھ، ۱۱۵: ۲ (۱۹۷۵ء)۔

—۴— جامع المکایات ولوامع الروایات، ۸۰-۸۶، بحوالہ ”ہندوستان کے عہد میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری“، نفس مرچ، ۸۳۔

ادب کے اوراق میں محمود اور اس کے دربار کو بلند جگہ مل گئی۔ جن شعر انے محمود کے دربار میں شہرت پائی
ان میں فردوسی، عصری، عجبدی اور فرنخی خاص طور پر مشہور ہیں۔^(۱)

غزوی خاندان کی حکومت کم و بیش دو سو سال رہی۔ اس پورے عرصے میں متعدد ممالک کے
بہت سے علاما و فضلا، اکابر دین اور مشائخ عظام یہاں آئے جن سے خاص طور خطہ لاہور و ملتان اسلامی
شہر بن گیا۔ اسی زمانے میں شیخ حسین زنجانی، حضرت داتا گنج بخش بھویری، شیخ شاہ یوسف گردیزی، صفوی
الدین گازرونی، شیخ سلطان سخنی سرورو غیرہ نے اسلامی علوم و فنون کی اشاعت کی تو دوسری طرف
بزرگان دین نے لوگوں کے دلوں کو گرمایا اور اپنی تعلیم و تلقین اور ارشاد و ہدایت کے ذریعے بڑی
تعداد میں لوگوں کو حلقۂ اسلام میں داخل کیا۔ اس کے علاوہ بھی اور دوسرے بہت سے محدثین کرام
تھے جنہوں نے ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت اور درس و تدریس پر زور دیا۔ ان میں ابو الحسن علی
بن عمر لاہوری (۵۲۶ھ/۱۱۲۲ء)، شیخ محمد اسماعیل لاہوری (۳۴۸ھ/۱۰۵۶ء)، سید مرتفع (۵۸۹ھ/۱۱۹۳ء)
کے نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

شہاب الدین غوری کی کام یابی

۵۴۳ھ/۱۱۷۴ء میں شہاب الدین اپنے بھائی غیاث الدین کے حکم سے غزنی کے تخت پر
بیٹھا۔ اس کی فتح و کام رانی سے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور قدم جمانے کا تیسرا دور شروع ہوتا
ہے۔ یہ بھی محمود غزوی کی طرح قرامطہ باطنی کی سر کوبی میں سر گردان رہا اور اپنا پہلا حملہ
۵۴۶ھ/۱۱۷۶ء میں ملتان پر اس نے قرامطہ کے استیصال کے لیے کیا۔ اسی ضمن میں وہ ہندو راجا بھی
اس کے حملے کا نشانہ بننے جن کا سازباز قرامطہ سے تھا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ملتان سے متصل
قلعہ ’اچھ‘ کو اپنی فتوحات میں شامل کیا۔ یہاں کا نظام و نظم علی کرماج کے سپرد کر کے سلطان غزنی لوٹ
گیا۔

۵۴۹ھ/۱۱۷۹ء میں سلطان نے پشاور پر اپنا دوسرا کام یاب حملہ کیا، پھر لاہور پر لشکر کشی کی۔
۵۵۰ھ/۱۱۸۰ء میں انہوں نے سندھ کے شہر دیوال پر حملہ کیا۔ ۵۵۸۰ھ/۱۱۸۲ء میں اس نے دوبارہ

لاہور پر لشکر کشی اور اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد سیال کوٹ میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور اس کی حکومت حسین خرمیل کو سپرد کر کے غزنی چلا گیا۔ بعد میں خرسو ملک نے کھوکھروں اور ہندوؤں کو اپنا ہم نوا بنا کر مذکورہ قلعے پر حملہ کیا، مگر وہ ناکام ہوا۔ اس کی اطلاع شہاب الدین کو ہوئی تو اس نے ۱۱۸۹ھ / ۱۱۹۰ء میں لاہور پر حملہ کیا، بالآخر بات صلح پر ختم ہو گئی، پھر بھی بادشاہ نے اسے قید کر دیا اور ایک سازش میں ملوث ہونے کے جرم میں اس کا قتل کر دیا گیا۔ یہاں کی عگرانی بھی علی کرمائج کے سپرد ہوئی۔^(۷)

۱۱۹۱ھ / ۱۱۹۲ء میں سلطان نے بھنڈا پر حملہ کیا۔ یہ ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کا مرکز تھا، جو راجہ اجیر کے قبضے میں تھا۔ اس قلعے پر فتح پانے کے بعد یہاں کی حکومت ملک بہاء الدین ٹونگی کے سپرد کی اور خود غزنی چلا گیا۔ راستے ہی میں اسے خبر ملی کہ اجیر اور دہلی کے راجاؤں نے متعدد ہو کر بھاری فوج کو جمع کر لیا ہے اور بھنڈا کو مسلمانوں کے قبضے سے چھڑانے کے ارادہ سے نکل گیا ہے۔ اس وقت سلطان کے پاس فوج کی قلت تھی، مگر غیرت سلطانی نے گھوڑے کی باگ موڑنے پر مجبور کر دیا، اور جدھر سے پر تھوڑی راج آرہا تھا اسی طرف اپنی تھوڑی فوج لے کر نکل پر تھا نیسر سے چودہ میل دور ترائی کے قریب دونوں کا مقابلہ ہوا۔ لشکر کی قلت اور امیروں کی ناابلی کی بنا پر سلطان کو ہزیریت کا سامنا کرنا پڑا، یہاں تک کہ کھانڈے رائے راجہ دہلی کے ہاتھوں سلطان کو کاری ضرب پہنچی۔ وہ کسی طرح بچا کر یہاں سے نکلنے میں کام یاب ہو گیا اور غزنی پہنچ کر اس ناکامی کا تدارک کرنے لگا۔ اس ہزیریت کا اسے اتنا غم ہوا کہ وہ سال بھر تک دیوانہ سا بنا رہا، نہ اس نے اچھے کپڑے پہنچے اور نہ شبستان عیش ہی میں داخل ہوا۔^(۸)

اگلے سال ۱۱۹۲ھ / ۱۱۹۳ء میں دوبارہ ایک بڑی فوج لے کر پر تھوڑی راج سے مقابلہ کرنے کے لیے اسی مقام پر پہنچا۔ مقابلہ سخت ہوا، فیصلہ شہاب الدین کے حق میں ہوا۔ اس جنگ میں پر تھوڑی راج اور کھانڈے رائے قتل ہوا۔ اس کے بعد سلطان اجیر پہنچا، قلعے پر قبضہ کیا اور پھر پر تھوڑی راج کے بیٹے کولہ بی سے اقرار اطاعت لے کر واپس چلا گیا۔ اسی طرح راجہ دہلی سے بھی اقرار اطاعت لیا۔ واپسی پر اپنے غلام قطب الدین ایبک کو شہاہی ہند کا وائسرائے مقرر کر دیا۔ اس فتح نے ہندوستان میں

۷۔ محمد قاسم فرشته، تاریخ فرشته، ۱: ۲۱۹۔

۸۔ نفس مصدر، ۱: ۲۲۱؛ بیکی سرہندی، تاریخ مبارک شاہی (کلکتہ، ۱۹۳۱ء)، ۸، ۹؛ آکرام، مرجع سابق، ۹۲۔

مسلم حکومت کی بنیاد رکھ دی۔ دو سال کے بعد سلطان پھر ہندوستان آیا اور قتوں کے راجہ بے چند کو شکست دی۔ اسی دوران قطب الدین ایک نے گجرات، گوالیار، بیانہ، کول، بنارس وغیرہ اور بختیار خلجی نے بہار اور بگالہ فتح کر کے اسے اسلامی حکومت میں شامل کر لیا۔^(۹) ۱۲۰۶ء میں کھوکھروں نے بغاوت کی تو سلطان نے خود ہندوستان آکر اسے شکست فاش دی۔ اس کے بعد سلطان واپس جا رہا تھا کہ دریائے جہلم کے کنارے ایک اسمعیلی فدائی نے اسے شہید کر دیا۔^(۱۰)

کھوکھر قبائل مسلمانوں پر کس طرح مظالم کرتے اور ستاتے تھے اس کی تفصیل فرشتہ نے اپنی تاریخ میں اس طرح بیان کی ہے:

لاہور میں قیام کے زمانے میں شہاب الدین کو معلوم ہوا کہ ان غیر مسلم کھوکھروں نے، جو دریائے سندھ سے لے کر کوہ سواں کے دامن تک کے علاقے میں آباد ہیں، بڑے ہنگامے پیدا کر رکھے ہیں، وہ اس حد تک متعصب ہیں کہ ان کے آس پاس کی آبادی ان کے ظلم و ستم سے عاجز آچکی ہے، خاص طور پر پشاور اور اس کے گرد و پیش کے مسلمانوں کا تو جینما مشکل ہو گیا ہے، ان لامذہب کھوکھروں نے، خدا پرست مسلمانوں کے لیے پنجاب کا سفر کرنا بھی مشکل کر دیا ہے۔ یہ لوگ کسی مذہب (یا صول) کے پابند نہیں ہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ برائے، ان لوگوں کے ہاں یہ رواج ہے کہ جب ان کی لڑکی جوان ہوتی ہے تو لڑکی کا باپ یا جھانی اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے مکان کے دروازے پر آکھڑا ہوتا ہے، راستے چلنے والوں کو لڑکی کے خریداری کے لیے بلا یا جاتا ہے اگر خوش قسمتی سے کوئی شخص اس لڑکی کو پسند کر کے خرید لیتا ہے تو وہ لڑکی اس کے حوالے کر دی جاتی ہے، ورنہ اس بے زبان کو ویس موت کے گھٹ انتار کر اس کے بوجھ سے نجات حاصل کی جاتی ہے۔ ان لوگوں میں یہ دستور بھی رائج تھا کہ ایک عورت کئی کئی شوہروں کی زوجہ ہوتی تھی۔ جو شہر اس عورت کے گھر جاتا وہ باہر دروازے پر اپنا نشان لگا جاتا، تاکہ دوسرے شوہروں کو اس کی موجودگی کا علم رہے، ایسے عالم میں کوئی دوسرا شوہر عورت کے مکان پر آتا تو وہ نشان کو دیکھ کر اندازہ کر لیتا کہ اس وقت عورت تھا نہیں ہے، لہذا وہ فوراً واپس چلا جاتا۔ دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں یہ قوم بڑی ماہر تھی، خاص طور پر مسلمانوں کی دل آزاری سے تو وہ بہت خوش ہوتے تھے، الغرض یہ قوم ایک زمانہ تک اسی وحشیانہ انداز سے زندگی بسر کرتی رہی۔^(۱۱)

-۹- محمد اکرم، مرجع سابق، ۹۳۔

-۱۰- فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۲۲۹؛ منهاج سراج، طبقات ناصری (لاہور: ۱۹۵۲ء)، ۳۹؛ محمد اکرم، مرجع سابق، ۹۲۔

-۱۱- فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۲۲۸۔

مسلمان حکم رانوں کو تنجیر ملک کے علاوہ اتنا موقع کہاں میسر آتا کہ وہ بہ نفس نفس اشاعت اسلام کی طرف متوجہ ہوتا۔ ہماری رائے میں ایک سلطان کے لیے کفرستان کو اسلامی قلم رو میں شامل کر لینا ہی اشاعت اسلام کا بڑا ذریعہ ہے۔ پھر سلطنت میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ، علاو فضلا کی سرپرستی، مشائخ و صوفیاے کرام پر نوازش، مساجد و مدارس کے قیام وغیرہ پر خاص توجہ دینا، یہ سب دینی خدمات کے مظاہر ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کی ذاتی زندگی سے یا پھر سلطنت سے شریعت اسلام کی مکمل ترجیحی نہیں ہوتی، مگر جہاں کہیں بھی ایسے موقع ملتے جس سے بہ راست تنجیر قلب کیا جائے تو سلطان اس سے بھی پچھے نہ ہٹتا۔ اس کی ایک اہم مثال کھوکھروں کا قبول اسلام ہے، جو ایک نہایت سرکش قوم تھی اور برائی اور بے حیائی اس کی گھٹی میں پڑی تھی، جس کی ایک بڑی تعداد کو سلطان نے اپنی حکمت عملی سے اسلام میں داخل کیا۔^(۱۲)

شہاب الدین نے ایک طرف بڑھ بڑھ کر ہندوستان میں فتوحات حاصل کیں اور اسے اسلامی قلم رو میں داخل کیا، تو دوسرے طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے ہزاروں کی تعداد میں کفار ہند کو کلمہ شہادت پڑھوا کر حلقة اسلام میں داخل کیا، بلکہ تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ شہاب الدین کو جتنی بھی کام یابی ملی وہ حضرت کے فیوض و برکات کا شرہ ہے، بدایوں نے بھی اس کی تائید میں لکھا ہے کہ: ”وایں فتح بمحاجب راندن نفس مبارک رحمانی آں قطب رباني روی نمود“۔^(۱۳) اسی عہد کی ایک مشہور ہستی سید مرتضی کوئی (۵۸۹ھ / ۱۱۹۳ء) محدث بھی ہیں جو حدیث و تفسیر کے عالم کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ ان کے مقام عالی کو دیکھتے ہوئے سلطان نے انھیں اپنے درباریوں میں شامل کر لیا تھا۔ ان کا انتقال راجہ اودے پال ظفر آباد سے مقابلہ کرنے کے درمیان ہو گیا۔^(۱۴)

تگ نظر مورخوں نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ غوری نے ہندوستان اور یہاں کے اصلی اور قدیم باشندوں کو بر باد کرنے کے لیے متعدد حملے کیے اور مسلم سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔

-۱۲- فرشتہ، مصدر سابق، ۱۵۳-۱۵۲۔

-۱۳- عبد القادر بدایوی، منتخب الموارف (مکملہ، ۱۸۶۸ء)، ۱: ۵۰۔

-۱۴- محمد احمد، علم حدیث میں بر صغیر پاک و ہند کا حصہ (دہلی: مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۲ء)، ۷۳۔

یہ مفروضہ کسی بھی طرح درست نہیں ہے، کیوں کہ ہندوستان پر شہاب الدین کے حملے کی غرض و غایت غزنی خاندان اور قرامطہ کی تباہی و بر بادی تھی، پروفیسر خلیق احمد نظای لکھتے ہیں:

ہندوستان میں غوریوں نے جس حکم راں کو سب سے پہلے ختم کیا وہ ہندو نہیں بلکہ مسلمان تھا، بعض تذکروں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ خرسو ملک کے خلاف شہاب الدین نے کشمیر کے ہندو راجہ سے بھی مدد لی تھی۔ یہ بیان صحیح ہو یا غلط، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ غوریوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں جس سیاسی طاقت کو صدمہ پہنچایا وہ غزنیوں کی تھی۔ جب ہندو راجاؤں سے نبرد آزمائی شروع ہوئی تو سیاسی مصلحتیں جو راہ دکھاتی ہیں ان پر عمل ہوتا رہا۔^(۱۵)

بہ قول ڈاکٹر تاراجنڈ: ”غوری کے ہندوستان پر حملہ کرنے کے تین مقاصد تھے، اول تو ملدوں کو سزا دینا تھا جنہوں نے ملتان میں افتخار حاصل کر لیا تھا۔ دوسراً محمود کے خاندان کا خاتمه جو پنجاب میں حکمران تھے۔ تیسراً ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرنا۔“^(۱۶)

عہد قطبی کے ثمرات

سلطان شہاب الدین کا جب انتقال ہوا تو اس کے تین غلام موجود تھے، جن کے زیر نگرانی الگ الگ صوبے تھے۔ قطب الدین ہندوستان میں، تاج الدین یلدوز غزنی میں، ناصر الدین قباجہ سندھ اور ملتان میں۔ سلطان کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا سلطان محمود و راشتی تخت پر بیٹھا اور ”فیروز کوہ“ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ محمود نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی قطب الدین ایک کو ہندوستان کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ اس طرح وہ ۱۲۰۶ء میں ہندوستان کا خود مختار فرمان روا ہوا۔ صرف چار سال ہی سلطان کی حیثیت سے حکومت کرنے کے بعد ۱۲۱۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس سے قبل وہ سولہ سال تک دہلی میں نائب السلطنت کی حیثیت سے رہا۔ اس عرصے میں اس نے ہندوستان کے بہت سے دور دراز علاقوں بھی فتح کیے اور اسے سلطنت غزنی میں شامل کیا۔ ان چار سالوں میں اس نے خاص طور حکومت کے انتظام و انصرام پر توجہ دا اور اپنی سلطنت کو عیوب و نقائص سے پاک رکھنے کے لیے اہم اقدامات کیے۔ رعایا کی خوش حالی پر توجہ دی اور شریعت اسلامیہ کو ہندوستان میں رواج دیا جس کی وجہ سے وہ ایک عادل بادشاہ کہلایا اور مختلف اسلامی القاب سے نوازا گیا۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے

-۱۵۔ خلیق احمد نظای، سلطانین دہلی کے مذہبی رجحانات (دہلی: ندوۃ المصطفین، ۱۹۵۸ء)، ۸۹۔

-۱۶۔ تاراجنڈ، اہل ہند کی مختصر تاریخ، ۱۸۰-۱۸۱۔

لوگ اسے لکھ بخش کہتے تھے۔^(۱۷) اس نے دہلی میں قوت الاسلام کے نام سے ایک عظیم الشان مسجد بنائی۔^(۱۸) دہلی کا قطب مینار اسی کا تعمیر کردہ ہے، مگر اس کو تعمیل کرنے کا سہرا اس کے داماد اتمش کے سر جاتا ہے۔^(۱۹) اسی طرح اس نے ایک مسجد اجیر میں تعمیر کروائی جو تاریخ میں ڈھانی دن کا جھونپڑہ کھلاتی ہے۔^(۲۰)

قطب الدین ایک کے ذریعے سلطنت دہلی کے قیام سے ایک طرف مسلمانوں کو دینی، مذہبی، سماجی، سیاسی حیثیت کو استحکام و دوام حاصل ہوا، تو دوسری طرف یہاں کے ہنود کے لیے بھی بہت سے فوائد کے دروازے وا ہو گئے، کیوں کہ مسلمانوں کے روز مرہ کے عادات و اطوار، سماجی مساوات کے اصول و ضوابط نے انھیں بہت زیادہ متاثر کیا اور ان کے اندر بھی داعیہ پیدا ہوا کہ صدیوں پرانی بھیج بھاؤ کی زنجیروں کو گلے سے اتنا رچھکا جائے، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

ترکوں کے حملوں کے وقت ہندوستان طبقائی امتیازات اور چھوٹوں چھوٹوں چھات کے مہک تصورات کی دل دل میں پھنسا ہوا تھا، اعلیٰ طبقے شہروں میں رہتے تھے اور پورا سماجی نظام ان کے لیے زندگی ساری نعمتیں مہیا کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ چھوٹے طبقے کے لوگ شہر سے باہر رہتے تھے۔ ان کی زندگیاں غمبت و خواری کی دردناک داستانیں تھیں۔ مذہبی کتابیں پڑھنا تو درکنار، سنتا بھی جرم تھا۔ مندوں کی شکل انہوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شہر کی چہار دیواری میں طلوع آفتاب کے بعد وہ کام کرنے کے لیے داخل ہوتے تھے اور غروب سے پہلے باہر نکل جانا پڑتا تھا۔ ایک ہی جرم کے لیے مختلف سزاویں تھیں۔ اعلیٰ طبقے کے لیے کچھ اور، اور نچلے طبقے کے لیے اور۔ ایسے سماجی نظام کو ختم کرنے والے کے ساتھ محبت کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا۔ ایک نے جس سماجی نظام سے ملک کو روشناس کیا اس کے دوزبر دست انقلابی اثرات ہندوستان کے ہر بنے والے نے محسوس کیے ہوں گے۔^(۲۱)

قطب الدین کے تعلقات علماء و مشائخ سے بھی بڑے خوش گوار تھے۔ ان کے دامن دولت سے قاضی حمید الدین، افتخار علی بن عمر الحمودی، فخر مدرسہ صدر الدین حسن نظامی، مولانا بہا الدین اوسی

۱۷۔ فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۲۲۱۔

۱۸۔ فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۲۳۷۔

۱۹۔ ثروت صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ (دہلی: مرکزی کتبہ اسلامی، ۱۹۹۸ء)، ۲: ۱۳۳۔

۲۰۔ سریسید احمد خاں، آثار الصنادید (دہلی: سنشل بک ڈپ، ۱۹۶۵ء)، ۵۲-۵۳۔

۲۱۔ نظامی، سلطنتیں دہلی کے مذہبی رحمانات، ۳: ۹۳۔

جزے ہوئے تھے۔ بڑی مقدار میں انعام و اکرام سے علماء و مشائخ کو نوازتا تھا، بلکہ انہمہ اور علماء کے بارے میں اس کی رائے یہ تھی کہ یہ لوگ شریعت کی انگوٹھی کے نگینے ہیں۔^(۲۲)

شمس الدین التمش کی خداترسی

قطب الدین ایک کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا آرام شاہ تخت پر بیٹھا۔ مگر اس کی ناہلی کو دیکھ کر ارکین سلطنت نے جلد ہی اسے معزول کر کے سلطان شمس الدین التمش کو ۶۰۷ھ / ۱۲۱۱ء میں تخت دہلی پر بیٹھایا۔ یہ قطب الدین ایک کا لے پا لک بیٹا اور داماد تھا۔ اس نے چھیس سال تک ہندوستان میں فرماں روائی کی۔ قطب الدین ایک جس طرح ہندوستان کی اسلامی حکومت کا بانی ہے، اسی طرح شمس الدین التمش کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اس نئی اسلامی سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط کر دیا۔ خود ایک خداترس بادشاہ تھا، نماز مسجد میں باجماعت ادا کرتا تھا، اس کے ساتھ وہ بہت ہی بیدار مغز تھا۔ اس کے عہد میں مغلوں نے ایران اور عراق میں تباہی پھانی شروع کی۔ التمش نے اس کا مقابلہ کیا اور ہندوستان کو اس کے قبہ سے بچائے رکھا۔^(۲۳) اس کے عہد میں بڑی تعداد میں لوگ ترکستان، ایران، ماوراء النہر سے ترک وطن کر کے ہندوستان آئے جس سے یہاں کے علماء، فضلا اور صوفیا و مشائخ کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ تاج الدین سنگریزہ، امیر روحانی ناصری، بہاء الدین علی، قاضی حمید الدین ناگوری، حاجی مجدد الدین، فخر الملک عصامی، قاضی منہماج سرانج، مولانا جلال الدین نظامی، نور الدین مبارک غزنوی، شیخ نجیب الدین بخشی، قطب الدین بختیار کاکی، جلال الدین تبریزی، قاضی قطب الدین کاشانی جیسے علماء، فضلا، صوفیا، مشائخ اور شعرا وغیرہ نے علم و عمل اور واعظ و ارشاد کی محفل گرم کر رکھی تھی۔ ان کے قیام کی وجہ سے ہندوستان کے بعض مرکزی شہر اوق، دہلی، بدالیوں، لکھنؤ وغیرہ میں مرکزی مدارس قائم ہوئے، جہاں وہ تدریس کے فرائض بڑی ذمے داری اور فکرمندی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ ان مدارس کے قیام میں سلطان کے علاوہ امراء کی بھی سرپرستی حاصل تھی۔ سلطان کے عہد میں بدالیوں، نندوار ضلع بجور میں عالی شان مسجدیں، عید گاہیں اور حوض تیار ہوئے۔ دہلی میں حوض شمسی کی تعمیر اور قطب بینار کی تعمیر اس کے مذہبی احساس و فکر کی آئینہ دار ہے۔ حوض شمسی کے متعلق کہا جاتا

- ۲۲ - نفس مرچع، ۹۵، ۹۳، ۹۲۔

- ۲۳ - محمد اکرام، آب کوثر، ۱۰۰۔

ہے کہ یہ ایسا مقام ہے جہاں دعا قبول ہوتی ہے، وہ خاص بندوں کا مقام ہے، وہ مقام رحمت ہے، مقام مغفرت ہے، وہ عابدوں اور زاہدوں، صالح لوگوں، بزرگوں اور ابدالوں کی جگہ ہے۔^(۲۴)

رعایا کی داد رسی اور انصاف پروری کا جو طریقہ اس نے اختیار کر رکھا تھا اس سے اس کی حکومت نے اور بھی زیادہ عروج حاصل کیا۔ اس نے حکم دیا کہ مظلوم پیلے کپڑے پہن کر پھرا کریں تاکہ بادشاہ انھیں فورا پہچان لے اور بروقت انھیں انصاف مل سکے۔ رات کے لیے اس نے اپنے دروازے پر زنجیر لٹکانے کا حکم دیا، تاکہ مظلوم آکر اسے ہلائے تو بادشاہ فوراً اپنی خواب گاہ سے نکل کر آئے اور مقدمے کا فیصلہ کرے، مگر وہ اس پر بھی قانون نہ ہوا، اور کہا کرتا تھا کہ لوگوں پر رات کو ظلم ہوتا ہو گا اور صحیح تک فیصلے میں دیر ہو جاتی ہے، لہذا یہ بھی حکم دیا کہ فوراً فریقین کو طلب کر کے فیصلہ کیا جائے۔^(۲۵)

سلطان کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ ہمیشہ صلح کی پالیسی پر عامل رہا۔ اس نے یقیناً علماء مشائخ کی صحبت اختیار کی اور ان کے ارشاد وہدایت سے اپنے اذہان و قلوب کو منور کیا اور ان کی رائے صائب سے حکومت کے بہت سے امور انجام دیے، مگر ایک ایسے معاملے میں جہاں ہندوؤں پر زیادتی ہو رہی تھی، اس نے علمائی بات ماننے سے انکار کر دیا اور انھیں معقول جواب دے کر خاموش بھی کر دیا۔ اس وقت ہندوستان کی جو صورت حال ہے، اس کے پیش نظر إما القتل و إما الإسلام کے اصولوں پر عمل کرنا مناسب نہیں ہے۔^(۲۶)

رضیہ سلطانہ کا تدبیر

شمس الدین الشش کے انتقال کے بعد اس کا منجھلا لٹکا رکن الدین (۱۲۳۳ھ/۱۸۱۴ء)۔ ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء) دہلی کے تخت پر بیٹھا، مگر زیادہ دونوں تک حکومت کرنا اسے نصیب نہ ہوا۔ اس کی ناسیحی کی بنا پر پورے ملک میں بغاوت پھیل گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر بڑی چالاکی سے رضیہ نے اپنے

۲۴۔ نظامی، مرجح سابق، ۱۲۹۔

۲۵۔ ابن بطوطہ، سفرنامہ ابن بطوطہ (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۶۱ء)، ۲۲۷۔

۲۶۔ نظامی، مرجح سابق، ۱۱۱۔

بادپر کے تخت کو حاصل کر لیا اور ۱۲۳۰ء سے ۱۲۳۶ء تک تخت دہلی کو رونق بخشی۔^(۲۷) اسلامی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک عورت خود مختار حکم راں ہوئی۔^(۲۸) وہ ایک پڑھی لکھی اور عقل مند خاتون تھی، غورو فکر کی عادی تھی، کتابیں پڑھنے اور مطالعے کی شائق تھی۔ کلام اللہ کی تلاوت کا بڑا اہتمام کرتی تھی۔^(۲۹) انھیں لیاقتوں کی بنا پر اس نے ملک کا انتظام نہایت خوبی سے سنبلالا۔ بعض امیروں نے اس کی بادشاہت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا اور مقابلے پر مستعد رہے۔ چند ہی روز میں اس نے بگالہ تا اڑیسہ اور پشاور تا کراچی تک اپنی سلطنت مستحکم کر لی۔ اس نے اپنی مختصر حکومت میں ملکی انتظام و انصرام کے ساتھ عوام کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی توجہ دی اور مدرسہ ناصریہ میں اچھے اپنے عالموں کو داخلہ دے کر تعلیم و تربیت پر مامور کیا۔^(۳۰) اگر رضیہ سے ایک اہم لغزش نہ ہوتی (یعنی ایک جبشی غلام یاقوت کو زیادہ با اختیار بنا دینا اور پھر اس پر دل و جان سے فریفہ ہونا) تو یقیناً وہ لمبے عرصے تک حکومت کرتی، کیوں کہ اس کے اندر حکومت کرنے کی تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں، مگر لوگوں نے اس کے ساتھ وفانہ کی اور ۱۲۳۵ھ/۱۲۳۸ء میں اسے قتل کر دیا گیا۔

پاک طبیعت ناصر الدین محمود

رضیہ سلطانہ کے بعد کئی سال ہنگامے رہے۔ اس دوران کہرام شاہ اور مسعود تخت نشین ہوئے۔ آخر کار امرانے اس کے بھائی ناصر الدین محمود کو ۱۲۳۶ء میں تخت دہلی پر بٹھایا۔ یہ بڑا سیدھا اور نیک دل تھا۔ سلطنت کے خزانے کو رعایا کی امانت سمجھتا تھا اور قرآن مجید لکھ کر روزی کماتا تھا۔^(۳۱) عبادت و ریاضت میں مشغول رہتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اسے سیاسی امور اور انتظام حکومت سے دل چسپیاں کم تھیں۔^(۳۲) جس کا بادشاہ کو احساس بھی تھا۔ باوجود اس کے وہ چاہتا تھا کہ حکومت میں کوئی خرابی اور عوام کو تکلیف نہ ہو، اس لیے اس نے غیاث الدین بلبن جو پنجاب کا صوبہ دار رہ چکا تھا کو اپنا وزیر

۲۷۔ ابن بطوط، مصدر سابق، ۲۰۸؛ سرہندی، تاریخ مبارک شاہی، ۲۲-۲۵۔

۲۸۔ محمد اکرم، آب کوثر، ۱۰۰۔

۲۹۔ بشیر احمد دہلوی، واقعات دارا حکومت (آگرہ: شمس پریس، ۱۹۱۹ء)، ۱: ۵۶۔

۳۰۔ سید صباح الدین عبدالرحمن، بزم مملوکیہ (اعظم گرش: مطبع، معارف، ۱۹۵۳ء)، ۱۲۹۔

۳۱۔ سفرنامہ ابن بطوط۔

۳۲۔ محمد حبیب، خلیف احمد نظاری، جامع تاریخ ہند (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۰۱ء)، ۳۶۵-۳۶۶۔

اعظم بنا کر سلطنت کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے بلبن کو تاکید کر دی تھی کہ تم کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے میری خدا کے سامنے رسوائی ہو۔^(۳۳) اس کی دین داری، رعایا پروری اور عدل و انصاف کے سامنے امرا و عوام نے گھٹنے لیے اور کوئی ایسی بغاوت نہ کی جس سے حکومت کے کام میں رخنہ پڑے۔ اس طرح بیس سال حکومت کرنے کے بعد ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء میں داعی اجل کو لیک کہا۔

رعایا اور محتاجوں پر بادشاہ جس طرح نوازش کرتا تھا اس کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرشتہ نے لکھا ہے کہ ایک حاجت مند اس کے پاس اس وقت حاضر ہوا جب وہ اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے قرآن کی تلاوت کر رہا تھا، حاجت مند کی نظر اس مقام پر پڑی جہاں مکر رفیعہ، لکھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ 'فیه' مکر ہو گیا ہے۔ اس کے کہنے پر بادشاہ نے قلم سے ایک 'فیه' پر گول دائرہ کھینچ دیا۔ پھر ضرورت مند کو اس کی ضرورت کے مطابق سامان دے کر رخصت کر دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس دائرے کو صاف کر دیا۔ ایک غلام جو سارا ماجرا دیکھ رہا تھا، اس نے بادشاہ سے ایسا کرنے کی وجہ معلوم کی۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ وہ ضرورت مند تھا، اگر اس کی بات نہ مانتا تو وہ اپنی ضرورت کا اظہار کیے بغیر مایوس ہو کر لوٹ جاتا۔ اس لیے اس کی موجودگی میں میں نے حلقہ بنادیا اور جب وہ چلا گیا تو میں نے یہ حلقہ مٹا دیا۔ دنیا میں دل کے غباروں کا دور کرنا مشکل ہے، لیکن کاغذ کا نقش مٹانا آسان ہے۔^(۳۴)

اس زمانے میں عموماً بادشاہ اپنے پاس کئی کئی بیگمات رکھتے تھے، مگر ناصر الدین محمود نے صرف ایک بیوی پر اکتفا کیا۔ اس کی بیوی نے ایک بار بادشاہ سے کہا کہ روٹی پکاتے پکاتے میرے ہاتھ جل جاتے ہیں، مجھ سے آئے دن چوہلہا بھی جھونکا نہیں جاتا۔ اس لیے کوئی خادمہ دیں۔ سلطان نے جواب دیا بیت المال پر بندگان خدا کا حق ہے، میری ملکیت نہیں ہے۔ اس کے بعد بیوی سے کہا کہ اس چند روزہ پریشانی پر صبر کرو، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس مشقت کے بد لے تمہاری خدمت کے لیے حور دے گا۔^(۳۵)

۳۳۔ بدیوانی، منتخب التواریخ، ۱: ۸۹؛ سعید احمد اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج و زوال (دلیل: ندوۃ المصفین، ۱۹۶۳ء)،

-۲۲۱

۳۴۔ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ۱: ۲۷۶

۳۵۔ نفس مصدر، ۲۷۶-۲۷۵

بادشاہ عشق رسول میں ہر وقت سرشار رہتا۔ نبی اکرم ﷺ کا نام زبان پر لانے میں حد درجہ احترام کرتا تھا۔ اس کے ایک ندیم کا نام محمد تھا اور اسی نام سے ہمیشہ اس کو پکارتا تھا۔ ایک دن حسب معمول سلطان نے اسے تاج الدین کہہ کر پکارا۔ ندیم شاہی حکم کی تعییل کے بعد اپنے گھر چلا گیا اور خوف سلطانی کا گمان کر کے تین دن تک دربار میں نہیں آیا۔ بادشاہ نے اسے بلا بھیجا اور نہ آنے کا سبب دریافت کیا۔ اس نے تبدیلی نام سے پکارے جانے کو اس بات پر معمول کیا کہ کوئی بد گمانی ہو گئی ہے، تب بادشاہ نے کہا کہ میں نے جس وقت تم کو طلب کیا اس وقت میں بے وضو تھا اور بے وضو محمد کا نام لینے میں مجھے شرم آئی، اس لیے میں نے نام تبدیل کر کے تصحیح بلایا۔^(۳۶)

مشائخ صوفیا میں حضرت بابا فرید گنج شکر کا حد درجہ احترام کرتا تھا، کئی مرتبہ ان سے ملاقات کی غرض سے ان کے آستانے پر حاضر ہوا، ساتھ ہی علام پر بھی بڑی نوازش کرتا تھا۔ علم و فن کے لیے کافی تعداد میں روپے خرچ کیا کرتا تھا۔ شیخ عماد الدین، جلال الدین کاشانی، قاضی شمس الدین بہراچی، شیخ الاسلام بہراچی، شیخ الاسلام جمال الدین بسطامی اور مولانا قطب الدین کے علاوہ قاضی منہاج سراج وغیرہ اس کے دامن دولت سے ہمیشہ جڑے رہے۔^(۳۷) شمارے بھی اس کے دربار میں بڑا عروج پایا۔^(۳۸)

غیاث الدین بلبن کا عہد زریں

سلطان غیاث الدین بلبن ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۱ء میں ناصر الدین محمود کے انتقال کے بعد تخت دہلی پر بیٹھا اور بیس سال تک حکومت کی۔ اس سے پہلے وہ وزیر اعظم کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ اس طرح اسے چالیس سال تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔ یہ بھی بڑی خوبیوں کا مالک تھا۔ دین داری اور عبادت گزاری سے غافل نہ رہتا۔ وہ علام اور نیک لوگوں کی صحبت بہت پسند کرتا تھا۔ اگر کسی عالم دین کا انتقال ہوتا تو اس کے جنازے کی نماز میں شرکت کرتا اور اس کے ورثا کو تحفے تھائے سے

- ۳۶ - نفس مصدر، ۱: ۲۷۲۔

- ۳۷ - سید صباح الدین، بزم مملوکیہ، ۱۹۲۔

- ۳۸ - نفس مرجع، ۱۲۰۔ ۱۹۳۔

نواز تا۔^(۳۹) لیکن امور ملکی میں وہ علام کے مشورے اور شرع کے فضیلے پر نہ چلتا، بلکہ اپنی رائے اور ملکی مصلحتوں کو زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی حکومت میں بڑا من رہا اور کوئی سرکاری عہدے دار ڈر کے مارے رعایا پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی سلطنت میں مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اسی وجہ سے ہندو اسے بہت عزیز رکھتے تھے۔ بلبن کا یہ کارنامہ بڑا ہی اہم ہے کہ اس نے مغلولوں کو کئی بار ٹکست دی۔ مغلولوں سے جنگ کرتے ہوئے سلطان کا لڑکا شہید ہوا۔^(۴۰) مغلولوں کے خوف سے اسلامی دنیا کے لوگ ادھر ادھر منتشر ہوئے تو بلبن نے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو اپنے ملک میں امن کی زندگی گزارنے کے لیے جگہ دی۔ وہ علام کی بھی بڑی قدر کرتا تھا اور بڑی تعداد میں علام ان کے دربار میں موجود رہتے تھے، یہاں تک کہ علام کی غیر موجودگی میں کھانا غیبیں کھاتا تھا۔ ان علام میں مولانا برہان الدین، شیخ الدین عبدالعزیز، شیخ سراج الدین ابو بکر، مولانا شرف الدین دلوابی، مولانا برہان الدین، مولانا مال الدین زاہد، مولانا شمس الدین خوارزمی، مولانا فخر الدین ناقہ وغیرہ تھے، جو ان کے دربار میں علم و اخلاق کا چراغ روشن کیے ہوئے تھے۔^(۴۱) مشائخ سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کو وہ بہت محبوب رکھتے تھے۔ اسی طرح اس نے عوام کی تعلیم پر بھی بڑی توجہ دی۔ دہلی کے دو مدرسے معزیہ اور مدرسہ ناصریہ کے اخراجات شاہی خزانے سے پورا کیا جاتا تھا۔^(۴۲) بلبن نے طویل مدت تک حکومت کی اور شان دار حکومت کرنے کے بعد ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۵ء میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کے انتقال سے عوام و خواص کو بڑا رنج ہوا اور غم میں لوگوں نے اپنے کپڑے تار تار کر لیے اور ننگے سر جنازے کے پیچے چلے۔^(۴۳)

غیاث الدین کی کامباب حکومت اور صالح فکر کی غماز اس کی وہ موثر نصیحت ہے جو اس نے اپنے بیٹوں کی تھی۔ قاسم فرشتہ نے لکھا ہے:

۳۹۔ ضیاء الدین برلن، تاریخ فیروز شاہی (کلکتہ: ۱۸۷۲ء)، ۳۵؛ محمد اکرم، مرجح سابق، ۷۰۔

۴۰۔ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ۱: ۲۹۹۔

۴۱۔ علی اصغر حکمت، سر زمین ہند، (تہران یونیورسٹی، ۱۹۵۹ء)، ۱۔

۴۲۔ سید صباح الرحمن، بزم مملوکیہ، ۲۳۶۔

۴۳۔ ظایم، جامع تاریخ ہند، ۷۔

سلطان شمس الدین اش فرماتے تھے کہ میں نے دو مرتبہ معز الدین محمد بہاء الدین سام کی مجلس میں سید مبارک غزنوی سے سنا ہے کہ بادشاہوں کے اکثر افعال شرک کی حد تک پہنچ جاتے ہیں، لیکن اس پر بھی اکثر کام سنت نبوی ﷺ کے خلاف سرزد ہوتے ہیں، لیکن اس پر بھی اگر ان چار چیزوں میں خلل پڑا تو اس سے بڑھ کر کوئی گنہ گار نہیں ہے۔ اول یہ کہ بادشاہوں کو چاہیے کہ اپنی حشمت اور دبابة کو مناسب فعل اور موقع پر استعمال کریں اور خلق خدا کی بھلائی اور خدا ترسی کے علاوہ کوئی اور بات ان کے پیش نظر نہ ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ کسی طرح کی بد کاری کو ملک میں راجح نہ ہونے دیں اور ہمیشہ فاسقوں اور بے غیر توں کو ذلیل و رسوا رکھیں۔ تیسرا یہ کہ سلطنت کے کام ہمیشہ عقل مندوں اور شاکستہ لوگوں کے سپرد کریں، مخلوق کی باگ دیانت دار اور خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں دیں، بد عقیدہ لوگوں کو اپنے ملک میں قدم نہ جمانے دیں۔ چوتھی بات یہ ہے کہ انصاف میں پوری کوشش کریں اور ماتحتوں کے کاموں کو برابر عدل کی ترازو میں تولتار ہے، تاکہ ملک میں ظلم اور جبر کا نام بھی نہ سنائی دے۔ اس کے بعد اپنے بیٹوں کو خطاب کر کے کہا کہ تم لوگ جو میرے جگر کے ٹکرے ہو، اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر تم میں سے کوئی کسی عاجز اور ناقصر پر ظلم کرے گا تو میں خالم کو ضرور سزا دوں گا۔^(۲۳)

بلبن کے انتقال کے وقت اس کا بیٹا بغراں خال جو بیگان کا حاکم تھا اور وہیں مقیم تھا، بلبن کی وصیت سے انحراف کرتے ہوئے لوگوں نے خان شہید کے بیٹے کیخسرو کو تخت پر نہ بٹھایا بلکہ بغراں خال کے بیٹے معز الدین کیقباد کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا۔ یہ نہ تو اپنے دادا کے نقش قدم پر چلا اور نہ اپنے باپ کی بات مانی اور بہت جلد عیش و عشرت میں پڑ گیا اور آرام پسندی کا وہ خوگر ہو گیا۔ اس سے حکومت کے انتظام والنصرام میں خلل پڑنے لگا، ملک کی حالت دگر گوں ہو گئی، جس سے فائدہ اٹھا کر پنجاب کے گورنر جلال الدین فیروز خلجی نے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح خاندان غلامان کا ۷۲۸۷ء میں خاتمه ہو گیا۔

جلال الدین خلجی کی دور اندیشی

شاکستہ خال جلال الدین فیروز خلجی ستر سال کی عمر میں تخت دہلی پر بیٹھا اور دارالخلافہ دہلی کے بجائے کیقباد کے نامکمل محل 'کیلو گڑھی'، کو بنایا۔ یہ بادشاہ بڑا ہی کریم انفس واقع ہوا، مذہب سے بے حد لگاؤ تھا، احترام شریعت کا پابند تھا، صوفیا میں حضرت نظام الدین اولیا سے عقیدت رکھتا تھا۔ مگر ان

سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔^(۳۵) علم و فضل کے اعتبار سے بھی اس کا عہد بڑا درخشاں رہا۔ وہ بڑے بڑے علام و فضلا اور دانش وردوں کی کہشاں تھا۔ امیر خسرو اور حسن سجرا نے اس کے دربار میں عروج حاصل کیا۔ اس نے ایک موقع پر خواہش ظاہر کی کہ جمعہ کے خطبے میں مجھے مجاہد نبی سبیل اللہ کے لقب سے یاد کیا جائے، مگر بعد میں جب اس مسئلے پر غور کیا تو خود کو اس کا اہل نہ پایا اور ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ حالاں کہ اس نے ہندوستان میں نمایاں کام یابی حاصل کی اور مغلوں کے خطرات سے ملک کو بچائے رکھا۔ جب لوگوں نے خطبے میں اس لقب کے شامل نہ کروانے کے وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا: ”مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے عمر بھر میں کسی وقت شانہ طمع اور طلب شهرت کے بغیر اللہ کے لیے تنخ زنی کی ہو یاد شمنان خدا کی طرف تیر پھینکا ہو۔ میں نے مغلوں سے جو مقابلہ کیا وہ شهرت کی خاطر کیا ہے، اعلاء کلمہ حق کے لیے تمنائے شہادت کے ساتھ جہاد نہیں کیا۔“^(۳۶)

اس نے نہ صرف مغلوں سے جہاد کیا بلکہ اب تک جو ملک کا حصہ اسلامی قلم رو میں شامل نہیں ہوا تھا، اسے بھی جنگ کر کے شامل کر لیا۔ دکن کی تسخیر اس کا اہم کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔ جب وہ رنتحنپور کی مہم پر تھا اور قلعے کا محاصرہ کیے ہوا تھا، مگر کام یابی ملنے میں دیر ہوئی تو یہ کہہ کر محاصرہ اٹھایا اور دارالسلطنت کو لوٹ گیا: ”میں اس جیسے دس قلعوں کو ایک مسلمان کے تار موکے مقابلہ میں اچھا نہیں سمجھتا، بھلا ایسے غنائم اور اسباب و اموال دنیا میں میرے کس کام آئیں گے کہ اتنے مسلمانوں کے قتل ہونے کے بعد میرے ہاتھ لگیں۔ جس وقت بیوہ عورتیں اور مقتولوں کے یتیم بچے میرے پاس آکر کھڑے ہوں گے، اس وقت اس قلعے سے جو کچھ مجھے حاصل ہوا ہو گا زہر سے زیادہ تنخ ہو جائے گا۔“^(۳۷) وہ قتل و خون ریزی کو برداشت نہیں کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ میں شریعت مصطفوی کے خلاف ہر گز اقدام نہ کروں گا۔

بادشاہ نے سات سال تک حکومت کی اور ایک سازش کے تحت اس کے داماد اور بھتیجے علاء الدین نے اس کا قتل رمضان ۱۲۹۵ھ / ۱۸۹۱ء میں کر دیا۔^(۳۸)

-۳۵ - نظامی، سلطانین دہلی کے مذہبی رحمانات، ۲۱۲۔

-۳۶ - شمس سراج عفیف، تاریخ قیروز شاہی (۱۸۹۱ء)، ۱۹۲۷ء؛ فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۳۲۳۔

-۳۷ - نفس مصدر، ۲۱۳-۲۱۲۔

-۳۸ - ابن بطوط، سفر نامہ، ۵۳۹۔

علاء الدین خجھی کی اقبال مندی

علاء الدین کو چچا کے قتل کے بعد بھی کچھ دنوں تک تخت دہلی سے مایوس ہونا پڑا، کیوں کہ جلال الدین کی بیوی نے اپنے بیٹے کو تخت پر بھا دیا تھا، مگر جب اسے اپنی اور بیٹے کی جان کا خطرہ پہنچنے کا اندریشہ ہوا تو وہ بھاگ کر اپنے دوسرے بیٹے ارکلی خاں صوبہ دار ملتان کے یہاں چلی گئی۔ سلطنت کو خالی دیکھ کر علاء الدین اس پر قابض ہو گیا۔ اعزاز و اکرام کے ذریعے امرا اور عوام کو بھی اپنا گرویدہ بنالیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ علاء الدین کے زمانے میں چوراںی چھوٹی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں اور ہر لڑائی میں یہ اقبال مند بادشاہ کام یا ب دکاران رہا۔^(۴۹) بلکہ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جتنی فتوحات اس بادشاہ کو حاصل ہوئیں اتنی ہندوستان کے کسی اور حکم ران کے حصے میں نہ آئیں۔ الغرض اس عہد میں مسلمانوں کے وقار میں بہت اضافہ ہوا اور ایک کامیاب مسلم حکومت ابھر کر سامنے آئی، جس میں ہندو اور مسلمان سب شیر و شکر نظر آتے ہیں۔^(۵۰)

برنی اور فرشتہ نے اس عہد کے چھوٹے بڑے علماء کے نام کی ایک فہرست اپنی تاریخ میں رقم کی ہے جو شاہی دربار کو رونق بخشنے کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔^(۵۱) فرشتہ کے بیان کے مطابق اس عہد میں اولیاء اللہ، علماء کرام اور مشائخ کا جیسا گروہ تھا ویسا مقدس گروہ کسی اور زمانے میں دہلی میں جمع نہ ہوا تھا۔ حضرت شیخ نظام الدین اولیا، مولانا رکن الدین بن شیخ صدر الدین، تاج الدین سید قطب، سید نجیب الدین اور ان کے بھائی سید مغیث الدین اپنے زہد تقوی، علم اور روحانی فیوض کے لحاظ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔^(۵۲) برنی کے بیان کے مطابق اس عہد میں جو علمائے ان میں سے ہر ایک علامہ وقت تھا اور اپنے فن کا ایسا امام سمجھا جاتا تھا کہ اس وقت اسلامی دنیا میں اس کا ثانی نہیں مل سکتا۔ علم کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس میں کامل دست گاہ رکھنے والے موجود نہ تھے۔ بعض علمائے امام غزالی اور امام رازی جیسی علمی وجہت اور تحریر کے مالک تھے۔ فقہ کے

۴۹۔ فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۳۹۹۔

۵۰۔ فرشتہ، مرجع سابق، ۱: ۳۹۲۔

۵۱۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ۳۵۲-۳۵۳؛ فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۳۹۳۔

۵۲۔ فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۳۹۲-۳۹۳۔

ایسے ایسے مہرین تھے کہ ابو یوسف اور محمد شیبانی کا مرتبہ ان کو حاصل تھا۔ مولانا جمال الدین شاطبی، مولانا علاء الدین مقری، خواجہ ذکی ایسے مہرین قراءت تھے کہ خراسان میں بھی ان کے مرتبے کا کوئی قاری نہیں مل سکتا۔^(۵۳)

یہ علاء الدین کی دور اندیشی تھی کہ اس نے علام کو سیاست سے الگ کر کے علمی اور مذہبی کاموں میں مشغول رکھا۔ جس سے اس عہد کی دینی فضائی طرح بھی مسموم نہ ہو سکی۔^(۵۴) باوجود اس کے اس عہد کا یہ الٹ ناک واقعہ ہے کہ یہاں کی دینی و مذہبی فضائی شہرت سن کر قاضی شمس الدین محمدث مصر سے چل کر ہندوستان اس غرض سے آئے کہ یہاں حدیث کی خوب اشاعت کر سکیں گے، مگر جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ سلطان شریعت کے بنیادی ارکان پر عمل نہیں کرتا تو وہ یہاں سے ماہیوس ہو کر لوٹ گئے اور بادشاہ کو تنبیہاً ایک رقمہ لکھ بھیجا جو بادشاہ کو اس کے لوٹ جانے کے بعد دست یاب ہوا، جس کا بادشاہ کو کافی مال رہا۔^(۵۵) اس نے پہلے شراب کی مجلس بند کر دی تھی۔ اس ممانعت کے پس پر وہ جو عوامل کار فرماتھے وہ مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھے۔ بعد میں صرف شراب نوشی کی اجازت دے دی وہ بھی تھا۔^(۵۶)

غیاث الدین تغلق کی دین داری

سلطنت خلجی کے زوال کے بعد غازی ملک غیاث الدین تغلق تخت دہلی پر ۷۲۰ھ / ۱۳۲۰ء میں رونق افروز ہوا۔ اس نے اپنی چند سالہ حکومت میں ایسے علمی، سیاسی، فلاحی اور معاشرتی امور انجام دیے جو ماقبل بادشاہ اپنی طویل مدت حکومت میں انجام نہ دے سکے۔ اس نے انیس بار منگولوں کو شکست دی اور ملک کو آفات و حوادث سے بچائے رکھا۔^(۵۷) اسی طرح اس نے دکن اور جنوبی ہند کی ہندوریاستوں کو، جو اب تک صرف باج گزار تھیں، ختم کر کے سلطنت دہلی میں ضم کیا۔ غیاث الدین مذہب کا بڑا پابند تھا اور نماز پابندی سے ادا کرتا تھا۔ جمعہ اور عیدین کی نماز کا بڑا اہتمام کرتا، روزہ رکھنے

- ۵۳ - برنس، تاریخ فیروز شاہی، ۳۵۳۔

- ۵۴ - نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ۲۳۱۔

- ۵۵ - برنس، تاریخ فیروز شاہی، ۷۹۹۔

- ۵۶ - محمد اکرم، مرجع سابق، ۱۲۱۔

- ۵۷ - صولت، بخت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ۲: ۱۵۱۔

میں کاہلی نہ کرتا۔ اکثر باوضو رہتا اور رات کو اٹھ کر نوافل ادا کرتا۔ خود اس نے مسکرات سے پرہیز کیا اور عوام کو بھی سختی سے روکا۔ اس نے ہمیشہ خود کو ان لوگوں سے دور رکھا جن کے انکار و خیالات عقائد میں فساد پیدا کرتے ہیں۔ ان خوبیوں کی وجہ سے وہ حامی ملت حجازی، حامی اسلام، پشت پناہ اسلام اور دین پرور و دین پناہ کے القاب کا مستحق قرار پایا۔^(۵۸) سلطان کو مشائخ صوفیہ سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ شیخ رکن الدین ملتانی اور بولی قلندر کی بڑی عزت کرتا تھا، مگر مسئلہ سماع پر نظام الدین اولیا سے سخت اختلاف رکھتا تھا۔ وہ شیخ سے اتنا زیادہ بذن ہو گیا کہ علماء کا محض طلب کیا اور کافی بحث و مباحثہ کے باوجود بھی اس کا دل صاف نہ ہوا۔

اس نے حکومت کا انتظام و انصرام اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ ہندو مسلم سب ہی اسے محبوب رکھتے۔ اس نے اپنے بھائی کی شادی ایک ہندو راج کماری سے محسن اس بنا پر کرداری کہ اس کے ذریعے ہندو مسلم تعلقات خوش گوار ہوں گے، مگر وہ خسر و خال اور اس کے حواریوں سے بھی خوب جم کر لڑا جو اسلام کی شیخ کنی پر تنتہ ہوئے تھے اور ملک بھر میں مساجد و معابد کے منبر و محراب میں بت رکھنے اور قرآن مقدس کی بے حرمتی کرتے تھے۔^(۵۹) خسر و خال کی اس طرح کی حرکتیں اس وقت مسلمانوں کے لیے ایک چیلنج تھیں، اگر سلطان فیروز اس کا مقابلہ نہ کرتا تو اسلام اور مسلمانوں کا حشر ہندوستان میں بہت براہو جاتا۔ بھی نہیں بلکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی اور دوسری شکل بھی اختیار کرتا تھا، جس کا اندازہ ابن بطوطہ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگا یا جاسکتا ہے:

جب خسر و ملک بادشاہ ہوا تو اس نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیے اور حکم دیا کہ تمام ممالک میں کوئی گائے ذبح نہ کرنے پائے۔ ہندو گائے کو مارنا جائز نہیں رکھتے۔ اگر کوئی گائے ذبح کر لیتا تو اس کو یہ سزادیتے ہیں کہ اسی گائے کی کھال میں سلوا کر جلوادیتے ہیں۔ یہ لوگ گائے کی حد درجہ تعظیم کرتے ہیں اور ثواب کے لیے بھی اور بطور دوا کے بھی اس کا پیشتاب پیتے ہیں، اور گوبر سے گھر اور دیوار لیتے ہیں۔ خسر و خال چاہتا تھا کہ مسلمان بھی ایسا کریں۔ اس لیے لوگ اس سے مقنف ہو گئے۔^(۶۰)

- ۵۸ - برنسی، تاریخ فیروز شاہی، ۳۲۱-۳۲۳؛ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ۱: ۳۱۸۔

- ۵۹ - برنسی، مصدر سابق، ۳۱۱۔

- ۶۰ - محمد اکرم، آب کوثر، ۳۹۳؛ ابن بطوطہ، سفر نامہ، ۵۵۳۔

اس پاک طینت بادشاہ کو زیادہ دنوں تک حکومت کرنے کا موقع نہ مل سکا اور ایک حادثے میں /۱۳۲۵ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ سلطان کی موت اسلامی ہندوستان کے لیے مصیبت عظیٰ تھی، کیوں کہ اس نے زمام حکومت اپنے مفاد اور کشور کشائی کے لیے نہیں سنگھالی تھی، بلکہ اسلام کی حفاظت و توسعہ کے لیے ہی لوگوں کے اصرار پر اس عظیم منصب کو سنگھالا تھا۔ چوں کہ خرسو کی نازیبا حرکت کے انسداد کے لیے ہی بادشاہ نے خرسو ملک سے جنگ کی تھی اور جس میں وہ کام یاب بھی ہوا، لہذا اس کام یابی کے بعد لوگوں نے اصرار کیا کہ آپ سے بہتر بادشاہ اس وقت کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد غیاث الدین نے جو تقریر کی وہ تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے۔ غیرت مندی اور جذباتیت سے پر مندرجہ ذیل اقتباس قابل ملاحظہ ہے:

میراتا ج و تخت میرا تیر کمان ہے۔ خرسو خاں کے انسانیت سوز مظالم سن کر دنیا میری آنکھوں میں تاریک ہو گئی اور مجھے اپنی زندگی پر شرم آنے لگی۔ میں نے اسی وقت تین باتوں کا عزم کر لیا۔ ایک یہ کہ دین اسلام کو اس کفر میں دوبادہ زندہ کروں... دوسرے یہ کہ اس سر زمین کو اس کمینہ اور بد ذات ہندوپچ کے ہاتھ سے چھین کر ان شہزادوں کو مرابت سلطنت پر متمکن کروں جو اس کے اہل ہیں، اور تیسرا عزم یہ تھا کہ جن بد بختوں اور نمک حراموں نے نسل شاہی کو اس بے رحمی سے بر باد کیا ہے انھیں کیفر کردار تک پہنچاؤں۔ یہ تینیوں ارادے مخفی خدا کی رضا جوئی کے لیے تھے، اور خدا کا بڑا فضل و کرم ہے کہ میری مضبوط ہمت نے ان تینیوں عزائم کو پورا کیا۔ میں تخت شاہی کا جو یا نہیں ہوں اور سوائے دینی جہاد کے تکوار نہ کھیچوں گا۔ اب اگر نسل شاہی میں سے کوئی شخص بھی زندہ بچا نہیں ہے تو یہاں اور بہت بڑے بڑے امیر موجود ہیں۔ مجھے اپنا گھوڑا اور دیوال پور کا ویرانہ سب سے زیادہ پسند ہے۔^(۱)

محمد شاہ تغلق کی فکری صالحیت

محمد شاہ تغلق /۱۳۲۵ھ میں تخت دہلی پر بیٹھا تو دہلی میں بڑوں، بوڑھوں اور بچوں نے مختلف طریقے سے خوشیاں منائیں۔^(۲) یہ بھی ایک دین دار بادشاہ اور نماز کا بڑا پابند تھا، اذان کی آواز سنتے ہی کھڑا ہو جاتا اور ختم ہونے کے بعد بیٹھتا۔ فخر کی نماز کے بعد دیر تک اور اد و ظائف پڑھتا۔ روزہ

-۶۱- مشنوی تغلق نامہ، ۱۳۱، بہ حوالہ، اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج و زوال، ۲۷۶۔

-۶۲- فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۳۲۵۔

پابندی سے رکھتا۔ پیاری کے باوجود مہارک کاروزہ قضاہ کرتا۔^(۲۳) لوگوں کو بھی نماز کا پابند بناتا۔ جو جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا اسے سخت سزا دی جاتی۔ حکم تھا کہ ہر شخص نماز و شرائط اسلام سکھے۔ اس حکم کی بنا پر سارے لوگ نماز کے پابند ہو گئے اور شرائط نماز وغیرہ کا فنڈ پر لکھ کر یاد کرتے نظر آنے لگے۔^(۲۴) اس کے عہد میں شراب کی کلی ممانعت تھی۔^(۲۵) وہ خود بھی ایک بڑا عالم تھا اور مختلف علوم میں دست گاہ رکھتا تھا۔ مختلف فنون سے متعلق کتابوں کو ہمیشہ زیر مطالعہ رکھتا۔ منقولات سے قدرے تنفر تھا۔^(۲۶) اسی علمی شغف کی بنا پر اس نے اپنی سلطنت میں عوام کی تعلیم پر بھی خاصی توجہ دی۔ اس نے متعدد مدارس قائم کیے اور ان میں کہنہ مشق اور باصلاحیت علاوہ فتحہ کو درس و تدریس کے لیے مامور کیا، قلقشندی کا بیان ہے کہ: ”اس وقت صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے، ان میں سے ایک شافعی مکتبہ فکر کا تھا، بقیہ سارے خفیوں کے تھے۔“^(۲۷)

اس نے تعمیرات مزار پر بھی خصوصی توجہ دی اور کئی مزارات تعمیر کیے یا جو پرانے ہو گئے تھے ان کی مرمت کروائی۔^(۲۸) ان خوبیوں کے علاوہ اس میں حکومتی امور کو سرانجام دینے کا سلیقہ بھی تھا۔ اس نے اپنی طویل مدت حکومت میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ ڈاکٹر تاراجنڈ نے اس کی ان خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اپنے مذہب کی پوری پیروی کرتا، وہ متعصب ہرگز نہ تھا۔ ہندوؤں کے ساتھ اس نے رواداری کا سلوک کیا۔ اس نے اس کی معاشرتی زندگی کی اصلاح کرنے کی کوشش کی اور رسم سنتی کو موقف کرنا چاہا۔ اس نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدوں سے نوازا۔^(۲۹)

- ۲۳۔ برنسی، مدرس سابق، ۵۲۲؛ سید ضمیر الدین احمد، مخدوم شرف الدین بیگی میری: احوال و افکار (سیرت الشرف) (پڑھ: خدا بخش اور میثمل لاہوری، ۱۹۹۳ء)، ۸۲۔
- ۲۴۔ ابن بطوط، سفر نامہ، ۲۰۲۔
- ۲۵۔ برنسی، مدرس سابق، ۳۶۰۔
- ۲۶۔ فرشتہ، مدرس سابق، ۱: ۳۲۶۔
- ۲۷۔ احمد بن علی القلقشندی، صبح الأعشی (قاهرہ ۱۹۱۵ء)، ۵: ۶۹؛ نظامی، سلطین دہلی کے مدھی رجحانات، ۳۵۳۔
- ۲۸۔ نظامی، نفس مرجح، ۳۷۵۔
- ۲۹۔ تاراجنڈ، اہل ہند کی مختصر تاریخ (دہلی: اردو اکیڈمی، ۱۹۶۸ء)، ۱۷۲۔

سلطان نے دہلی کے بجائے دیو گیر کو پائے تخت بنانے کے لیے دہلی کے عوام کو وہاں بھیجا، اس کے پس پرده خاموش تبلیغی جدو جہد تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمان نہ ہوں گے وہاں دین کی اشاعت نہیں ہو سکے گی، چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ علام و مشائخ زیادہ سے زیادہ دکن پہنچیں اور وہاں رہ کر اسلام کی تبلیغ کریں، پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

محمد بن تغلق کے قلب میں ایک خاموش تبلیغی جذبہ محرک نظر آتا ہے۔ وہ اسلامی تمدن کو ہندوستان میں ترقی پذیر دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر اس نے علام و مشائخ کو نہایت کوشش سے ان دور راز علاقوں میں بھیجا، جہاں مسلمان کی آبادی نسبتاً کم تھی۔ اس کی سیاسی بصیرت کا یہ فیصلہ تھا کہ جس جگہ مسلمان کی آبادی نہ ہو گئی وہاں مسلمانوں کے سیاسی نظام کی بنیادیں استوار کرنے کی ہر کوشش کوہ کندن و کاہ بر آور دن کی مصدق ہو گئی۔ چنانچہ دکن کے منسلکہ پر جب اس نے غور کیا تو اس کی نظر اسی پہلو کی طرف گئی۔ اس کے پیش رو باوجود بے پناہ طاقت اور قوت رکھنے کے دکن پر صرف اس وجہ سے براہ راست حکومت نہ کر سکے تھے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی نہ تھی۔ حد یہ کہ علاء الدین خلجی جیسے بادشاہ نے صرف خراج وصول کرنے پر اکتفا کر لیا تھا۔ ان حالات کے پیش نظر اس نے فیصلہ کیا کہ علام و مشائخ کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دکن بھیجا جائے، تاکہ وہاں رہ کر تبلیغ اسلام کریں اور اسلامی آبادی کو فروغ دیں۔ شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی شافتی زندگی کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ اگر یہاں کے ایک مضبوط تمدنی مرکز کو جنوبی ہند کی سر زمین میں منتقل کر دیا جائے تو شمالی ہندوستان کی تمدنی زندگی میں خاص کمی نہ ہو گی۔ لیکن دکن میں اسلامی روایات اور طرز زندگی کو پھیلانے کا کام اچھی طرح انجام پا جائے گا۔ جس منصوبہ کی تبدیلی دارالسلطنت کے نام سے مورخوں نے معمکنہ نیز انداز میں پیش کیا ہے وہ حقیقت میں اسلامی تہذیب و تمدن کی ترویج و اشاعت کے لیے ایک نہایت ہی منظم کوشش تھی۔^(۲۰)

فیروز شاہ تغلق کی مسامی جلیلہ

سلطان محمد تغلق کے انتقال (۱۳۵۱ھ / ۱۷۵۲ء) کے کئی دنوں بعد لوگوں کے کافی اصرار پر فیروز شاہ تغلق تخت سلطنتی پر رونق افروز ہوا۔ بلکہ چند علام و مشائخ نے انھیں زبردستی اس بار عظیم کو اس کے کاندھے پر ڈال دیا۔^(۲۱) تخت نشینی کی رسم ٹھٹھ میں ادا کی گئی۔ وہاں سے چل کر سلطان دہلی

- ۲۳۸ - ۲۳۹ - نظامی، مرجع سابق،

- ۳۵۳ : فرشتہ، تاریخ فرشتہ،

آیا۔ عوام کو خوشی ہوئی اور فیروز کے استقبال کے لیے پوری دہلی باہر نکل آئی۔^(۲۴) اس کی پوری زندگی شریعت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، دین و مذہب کا ہر لحاظ سے پابند تھا، کوئی بھی کام خلاف شرع نہ کرتا، مگر بادہ نوشی اور گانے بجائے سے وہ خود کو محفوظ نہ کر سکا۔^(۲۵) وہ عالم باکمال تھا، علم، فقہ اور نجوم سے بڑی دل چپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد میں فقہ کی کئی اہم اور مشہور کتابیں زیور تصنیف سے آرستے ہوئیں۔^(۲۶) جن میں فتاویٰ تاتارخانیہ بڑی مقبول و مشہور ہوئی۔

اس کے عہد میں علام کی بڑی تدر ہوئی، اس نے علماء، مفتیان کرام، حافظوں، مدرسون اور ارباب مساجد اور آستانہ داروں کو لاکھوں کی تعداد میں وظائف سے نوازا۔^(۲۷) عوام کی تعلیم کے لیے کم و بیش تیس مدارس قائم کیے، ان مدرسون میں مدرسہ فیروز شاہی، مدرسہ سری اور مدرسہ شاہزادہ بزرگ فتح خاں قبل ذکر ہے۔^(۲۸) کافی تعداد میں نئی مسجدیں تعمیر کروائیں اور بے شمار پرانی مسجدوں کی مرمت بھی۔^(۲۹) تعمیرات مزارات پر بھی اس کی خاصی توجہ رہی۔ سراج عفیف کے بے قول بادشاہ نے ایک سو بیس خانقاہیں تعمیر کرائیں۔^(۳۰)

بزرگوں کے قبر اور مزارات پر بعض مواقع پر غیر معمولی ازدحام ہوتا تھا، جہاں عورتیں بھی بہ کثرت جمع ہوتی تھیں۔ اس سے معاشرتی بگاڑ بڑھنے لگا تھا۔ سلطان نے ان جگہوں پر عورتوں کی حاضری کو منع کر دیا۔ اس تعلق سے فتوحات فیروز شاہی میں درج ذیل تفصیلات متی ہیں:

اس زمانے میں صوفیائے کرام اور بزرگوں کے مزاروں پر کثیر تعداد میں مردوں و عورتوں کا ازدحام ایک معمول بن گیا تھا، ان مواقع پر مردوں کے اختلاط سے بعض برائیاں جنم پاری تھیں۔ عورتوں کی بھی بجاڑ دیکھتے ہوئے کچھ بدنحصال واوباش قسم کے لوگ محض سیرہ تفریح کے لیے دہاں جاتے اور مختلف قسم کی مذموم حرکتوں میں ملوث ہوتے۔ لوگوں پر ان کے برے اثرات محسوس کرتے ہوئے سلطان فیروز شاہ تعلق

۷۲۔ برلنی، مصدر سابق، ۵۳۶۔

۷۳۔ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ۲۹، ۲۷، ۱۳، ۳۶۸۔

۷۴۔ نظایر، مرجع سابق، ۳۹۶۔

۷۵۔ برلنی، مصدر سابق، ۵۹۔

۷۶۔ فرشته، مصدر سابق، ۲۷۰۔

۷۷۔ نفس مدرس۔

۷۸۔ نفس مدرس۔

نے مزارات پر عورتوں کی حاضری منوع قرار دی اور اس کے خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزاں میں دیں۔ مغل دربار کے ایک ہندو مورخ سجاح رائے بھنڈاری کے بیان کے مطابق فیروز شاہ نے مسلم و ہندو عورتوں کو مزارات و منادر پر جانے کی ممانعت کی تھی۔ ایک دوسرے مورخ نے اس مسئلہ کو اور واضح کر دیا ہے کہ ان مقامات پر عورتوں کا جانا بہت سی خرابیوں کا باعث بتا تھا۔ اغلب یہی ہے کہ اس ممانعت کے وقت بھی فیروز شاہ کے پیش نظر وہی خرابیاں رہی ہوں گی جو اس طرح کے مقامات پر مردوزن کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہیں۔^(۷۹)

شیخ علاء الدین، شیخ نصیر، شرف الدین پانی پتی، قطب الدین منور مخدوم جہانیاں گشت کے علاوہ کئی کبار صوفیا سے ان کے گھرے مراسم تھے۔ بادشاہ ان میں سے بعض کی خانقاہ پر حاضری بھی دیتا تھا۔^(۸۰) باوجود مذہب کا شدید رنگ غالب ہونے کے ہندوؤں کو تھب کی بنا پر کبھی نہیں چھیڑا، بلکہ حتی المقدور ہر قسم کی سہولت فراہم کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو اس عہد کے مال دار ہو گئے، جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔^(۸۱)

جب علاء الدین خلجی کے عہد میں اباحتی فرقوں نے معاشرے میں بے حیائی اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی تو بادشاہ نے اس کے خلاف سخت اقدامات کیے۔ جس سے کچھ دنوں کے لیے یہ فتنہ دبا رہا۔ دوبارہ پھر اس فرقہ نے اپنے بال و پر بڑھائے تو فیروز شاہ تغلق نے اس کے ساتھ سخت کارروائی کی۔ یہ کس طرح سے معاشرے میں برائی پھیلاتے تھے اس کا اندازہ درج اقتباس سے کیا جاسکتا ہے:

ملادھہ کے ایک گروہ نے شہر میں اباحت کا دروازہ کھول دیا تھا۔ عمال شہر نے سلطان (فیروز شاہ) کے حضور میں عرض کیا کہ ملحدوں اور اباحتیوں کا ایک گروہ شہر میں پیدا ہو گیا ہے اور لوگوں کو اپنے باطل مذہب کی طرف دعوت دیتا ہے۔ (ان کی یہ روشن ہے کہ) ایک مقررہ دن مقررہ مقام پر جو اس کام کے لیے منتخب کر لیتے ہیں جمع ہو جاتے ہیں... اور ہبہ پرستوں کی سی رسم کے مطابق چاول اور پھول وہاں ڈالتے ہیں، جن لوگوں کو اپنا تالیع بنانا چاہتے ہیں ان سے اس زمین پر سجدہ کراتے ہیں اور کلمات کفر کی تلقین کرتے ہیں، ان سے کہتے ہیں کہ دین اسلام سے دست بردار ہو جاؤ اور اقرار کرو کہ تمہارا تالیع ہو گیا، اور بیٹیوں، عورتوں، ماڈوں اور بہنوں کو اس جگہ رات کے وقت جمع کرتے ہیں اور ان کو شراب پلاتے اور سور کا گوشت کھلاتے

۷۹۔ سلطان فیروز شاہ، فتوحات فیروز شاہی، ۸۔ ۹۔

۸۰۔ نظامی، سلطانین دہلی کے مذہبی رجحانات، ۳۰۸۔ ۳۱۷۔

۸۱۔ صولات، بلت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ۱: ۱۵۳۔

ہیں اور کپڑا اتار دیتے ہیں۔ پھر شب کی تاریکی میں جو عورت جس کے ہاتھ پر گئی، خواہ اس کی ماں ہو، بہن ہو یا بیٹی اس کے ساتھ زنا کرتے ہیں۔^(۸۲)

اس کی اڑتیس سالہ حکومت کو شان دار حکومت قرار دیا جاسکتا ہے، البتہ اس کے زمانے میں کچھ صوبے سلطنت سے نکل گئے جس کو حاصل کرنے کی اس نے زیادہ کوشش اس لیے نہیں کی کہ وہ قتل و خون ریزی کو ناپسند کرتا تھا۔ بنگال کے معمر کے میں بہت سے آدمی ہلاک ہوئے تو اس کا بادشاہ کو بڑا رنج ہوا اور لاشوں کو دیکھ دیکھ کر روتا تھا۔ لیکن اس زمانے کا الیہ یہ بھی ہے کہ بادشاہ کو زیادہ حیل و بردار پا کر مسلمانوں نے کتاب و سنت سے بے اعتنائی شروع کر دی تھی، بہت سی بدعتنی، پیر پرسی اور قبر پرستی کا زور ہو گیا اور خود بادشاہ بھی ان کم زوریوں کا شکار ہو گیا تھا۔ اس دور میں شریعت اسلامی کا سب سے بڑا نمائندہ سردار تاتار خاں تھا، اس نے بادشاہ کو بھی پابند شریعت رکھنے کی کوشش کی، لیکن اس کے انتقال کے بعد بادشاہ پر سے یہ دباؤ ختم ہو گیا۔^(۸۳) سلطان کا انتقال ۹۰۷ھ / ۱۳۸۸ء میں ہوا۔

سلطنت دہلی میں بگاڑ کے آثار

فیروز شاہ تغلق کے انتقال کے بعد ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔ جلدی جلدی اس خاندان سے کئی حکم راں اٹھے جو حکومت کے حق میں موزوں ثابت نہ ہو سکے، اس لیے یا تو قتل کر دیے گئے یا معزول کر کے در بدر کی زندگی گزارنے پر مجبور کیے گئے۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ محمد تغلق تھا، جس نے چھے سال کی خانہ جنگی کے بعد زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ جس سے سلطنت کی بنیادیں ہل گئیں۔ اس لیے جب ۹۸۱ء میں امیر تیمور (۱۳۳۶ء-۱۴۰۵ء) نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کا مقابلہ کرنے والی کوئی مضبوط طاقت یہاں نہیں تھی۔ تیمور نے دہلی کی فوج کو شکست دینے کے بعد دہلی فتح کیا اور اصفہان اور بغداد کی طرح یہاں بھی قتل عام کیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے مختلف حصوں میں صوبے داروں نے اپنی آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔ ۱۴۱۲ھ / ۸۱۵ء میں محمود تغلق کا انتقال ہو گیا تو ۱۴۱۳ھ / ۸۱۷ء میں خضر خاں دہلی پر قبضہ کر کے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی، جو سیدوں کی حکومت کہلائی۔ اس میں کل چار حکمران ہوئے۔ خضر

-۸۲ - نظامی، مرجع سابق، ۲۷-۲۸۲۔

-۸۳ - صولات، مرجع سابق، ۲: ۱۵۳۔

خان کے قبضے میں دہلی اور اس کے نواحی علاقے کے علاوہ پنجاب بھی تھا۔ بعد میں یہ علاقے بھی اس کے قبضے سے نکل گئے اور آخری سید حکم ران علاء الدین عالم شاہ کو صرف دہلی پر اکتفا کرنا پڑا۔ ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۵ء میں ایک پٹھان سردار بہلوں لودھی نے دہلی پر حملہ کر کے لودھی خاندان کی حکومت قائم کر لی۔^(۸۳)

سلطان بہلوں لودھی کی کسر نفسی

لودھی خاندان کا پہلا بادشاہ بہلوں لودھی ہوا، جس کی حکومت کاسرا جون پور سے ملتا تھا۔ اس نے مسلم سلطنت کو ایسے وقت میں سہارا دیا جب کہ وہ اپنے زوال کے دھانے پر تھی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ دہلی سلطنت کی عظمت رفتہ کو کسی بھی طرح سے بحال کیا جائے۔ اس میں وہ کافی حد تک کام یاب بھی رہا۔ یہ خود بھی دین دار تھا، اس لیے وہ کوشش کرتا کہ حکومت میں کوئی کام خلاف شرع نہ ہونے پائے۔ رحم دلی اور مفسر المزاجی کے اوصاف اس کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے۔ اس نے مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کو بھی خوش رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی فوج میں ہندوؤں کو بھی بڑی تعداد میں شامل کیا اور بڑے بڑے عہدوں سے نوازا۔ وہ صحیح سویرے نیند سے بیدار ہو جاتا اور ریاست کے معاملات کے حل کرنے میں دوپھر تک لگا رہتا، وہ ہذات خود عوام کی درخواستیں سنتا اور اس کام کو اپنے امرا و وزرا پر نہ چھوڑتا، دوپھر سے عشاکی نماز تک علمائی صحبت میں رہتا، قرآن پڑھنے یا اجتماعی عبادتوں میں اپنا وقت صرف کرتا تھا۔ علام و صوفیا کی بڑی عزت کرتا تھا، سب سے بڑی بات ان کے اندر یہ تھی کہ وہ امرا کے سامنے تخت پر نہ بیٹھتا تھا۔ بہلوں کا انتقال ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۳ء میں ہوا۔

سلطان سکندر لودھی کی علم پروری

سکندر لودھی نے ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۳ء میں مند نشینی اختیار کی۔ اس کے قبضے میں پنجاب اور ملتان تک کا علاقہ تھا، کچھ دنوں بعد اس نے بہار کو بھی فتح کر لیا۔ اس نے اپنا دارالخلافہ آگرہ کو بنایا جسے اس نے خود ۹۱۱ھ / ۱۵۰۶ء میں بسایا تھا۔^(۸۴) یہ بادشاہ بڑا بیدار مغز تھا، بہادر اور جری ہونے کے علاوہ علمی ذوق سے بھی بہرہ مند تھا۔ شیخ عبداللہ کے درس میں وہ حاضری دیا کرتا تھا مگر مصلحتاً مسجد کے گوشے میں

-۸۳- نظامی، جامع تاریخ ہند، ۹۶۸-۹۶۹۔

-۸۴- نفس مرجع، ۹۸۱۔

چھپ کر بیٹھ جاتا، جس کی خبر مولانا کو نہیں ہوتی۔ شیخ جمال الدین سے بھی علمی صحبت حاصل کی۔ وہ علامہ فضلا کی بڑی قدر دانی کرتا تھا۔ شیخ سعد اللہ، شیخ رزق اللہ مشتاقی، شیخ عبدالواہب بخاری سے اچھے تعلقات تھے۔ شیخ عبد القدوس گنگوہی کا وہ بڑا احترام کرتا تھا۔ شعرو شاعری سے بھی دل چھپی تھی اور گلرنی تخلص تھا۔ اس نے فارسی زبان کو بڑا عروج بخشنا، اس کے زمانے میں قابل قدر کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اسی زمانے میں بہت سے ہندوتوں نے بھی فارسی پڑھنا شروع کی۔ اس نے سماجی اصلاح پر بھی بہت زور دیا۔ مذہبی رسوم کے پردے میں جو برائیاں پھیلی ہوئیں تھیں اس کو سختی سے روکا۔ عورتوں کے لیے قبر کی زیارت منوع قرار دی۔ چیچک کے دیوی شکنستلا کی پرستش پر پابندی لگادی۔ بہت سی جعلی قبریں جو اس زمانے میں وجود میں آگئی تھیں، وہاں نہریں جاری کر کے ان کا نام و نشان مٹا دیا۔^(۸۶) اس کے مزاج میں کسی قدر درشتی پائی جاتی تھی، اس بنا پر ہندو اس سے خوش نہ تھے، مگر وہ مت指控 ہرگز نہ تھا۔ وہ اسلام کو دوسرے ادیان پر غالب دیکھنا چاہتا تھا اور حدود شریعت میں رہ کر یہ سب کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی مثال کرو کیشتر کے واقعے میں مل جاتی ہے، مگر میاں عبداللہ کے منع کرنے سے وہ ہندو کو اذیت پہنچانے سے باز رہا۔^(۸۷) بدھن برہمن کے قتل کا ذمے دار بالکلیہ اسے اس لیے نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ اس نے بدھن کے سلسلے میں علام سے فتوی طلب کیا اور جب سب لوگوں نے اس کے قتل کا فتوی دے دیا، تب اس کا قتل کیا گیا۔^(۸۸) سلطان تقریباً میں سال حکومت کرنے کے بعد ۱۵۲۳ھ / ۱۷۶۱ء میں ایک شدید مرض میں مبتلا ہو کر آگرہ میں فوت ہوا۔

اولوالعزم فاتح ظہیر الدین بابر

سکندر لودھی کے بعد اس کا لڑکا ابراہیم لودھی / ۱۵۱۷ء میں موروثی تخت پر بیٹھا، مگر اس کے اندر حکومت چلانے کی صلاحیت مفقود تھی، اس لیے پورے ملک میں بد نظمی پھیل گئی اور عوام اس سے تنفس ہو گئی، لہذا عالم خاں امیر پنجاب اور دیگر اعیان واشراف نے مل کر بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی، چنانچہ بابر نے تحقیق حال کے بعد ہندوستان پر ۱۵۲۳ھ / ۱۷۶۱ء میں حملہ کر کے

- ۸۶۔ ابو الحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت (لکھنؤ: مجلس نشریات اسلام، ۲۰۰۰ء)، ۵: ۳۷۔

- ۸۷۔ نظامی، سلطانین ولی کے مذہبی رجحانات، ۳۵۲-۳۵۳۔

- ۸۸۔ نظام الدین احمد، طبقات اکبری، ۳۲۳-۳۲۴۔

ابراہیم لودھی سے دہلی کا تخت چھین لیا۔ بہ قول گلبدن بیگم، بابر نے ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب دیکھا تھا۔^(۸۹) جس کی تعبیر آج کے دن سامنے آئی۔ اس طرح بابر نے مغل حکومت کی بنیاد باضابطہ طور پر رکھ کر عالم خال حاکم پنجاب کی توقعات پر پانی پھیر دیا۔ اس کے بعد اس نے لگاتار متعدد محل ہندوستان کے مختلف علاقوں اور صوبوں پر کیے اور ان کو فتح کر کے سلطنت دہلی میں شامل کیا۔ بابر کو یہاں ابتدا میں قدم جمانے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں کی عوام بابر کو اس لیے کراہت کی نگاہ سے دیکھتی تھی کی اس کا تعلق امیر تیمور سے تھا، جس نے کچھ ہی دن پہلے ہندوستان میں تہر برپا کر کے لوٹا تھا۔ اس نفرت کو دور کرنے میں بادشاہ نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا، یہاں تک کہ اس نے اپنے عمدہ عادات و اخلاق اور انعام واکرام کے ذریعے لوگوں کو بہت جلد اپنے سے قریب کر لیا۔ اب یہی لوگ نہ صرف بابر کے بھی خواہ بننے بلکہ اس کی آواز پر جان تک دینے کو تیار رہتے۔^(۹۰)

بابر گونا گوں خوبیوں اور اوصاف حمیدہ کا مالک تھا۔ علوم فلکیات سے اسے بڑی دل چپی تھی۔^(۹۱) دین داری کے ساتھ علم اور علامانوازی ورثے میں ملی تھی۔^(۹۲) بڑے بڑے علماء وقت کو اپنے گرد جمع کر کھا تھا۔^(۹۳) کتابوں کے مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ دنیا کے مختلف علاقوں سے عمدہ عمدہ کتابیں مانگلواتا، جس کے لیے اس نے ایک عمدہ لائبریری بنارکھی تھی۔^(۹۴) اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی عمدہ ذوق رکھتا تھا۔ کئی کتابیں اس نے اپنی یادگار چھوڑی ہیں، جن میں ترک بابری کو بڑا مقام حاصل ہے۔ فقہ بابری، رسالہ ولدیہ، مشتوی میمین، عروض رسالہ بھی اسی کی تصنیف ہیں۔ شعرو شاعری سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ دیوان بابری اس کی معیاری شاعری کا ترجمان ہے۔ خط بابری اسی کی ایجاد ہے، جس

- ۸۹۔ گلبدن بیگم، ہمايوں نامہ (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۲۶ء)، ۱۹۔

- ۹۰۔ ایف۔ رش بروک ولیم، ظہیر الدین محمد بابر، ترقی اردو بیورو (دہلی: ۱۹۸۹ء)، ۱۷۶-۱۷۷۔

- ۹۱۔ ترک بابری، بحوالہ عبدالجی德 سالک، مسلم ثافت ہندوستان میں (لاہور: ثافت اسلامیہ)، ۲۱۱۔

- ۹۲۔ سید صباح الدین عبدالرحمن، بزم تیموریہ (اعظم گڑھ: مکتبہ معارف، ۱۹۹۵ء)، ۱: ۷۷۔

- ۹۳۔ سید صباح الدین عبدالرحمن، ہندوستان کے سلاطین، علا اور شاہزادے کے تعلقات پر ایک نظر (اعظم گڑھ: مکتبہ معارف، ۱۹۶۳ء)، ۲۲۔

- ۹۴۔ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ۱: ۵۹۲۔

میں وہ قرآن کریم کی کتابت کر کے مکہ بھیجا کرتا تھا۔^(۹۵) اس نے عوام کی تعلیم پر بھی توجہ دی، جس کی زیادہ تفصیل تو نہیں ملتی، البتہ اپنی آپ بیتی میں اس نے یہاں کے تعلیمی نظام کے نقصان کا ذکر کیا ہے۔ وہ بزرگوں سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ جب کسی جنگی مہم پر نکلتا تو اولیا کے مزار پر حاضری ضرور دیتا۔^(۹۶) خواجہ عبید اللہ احرار کو وہ بے حد محبوب رکھتا تھا، خواجہ بھی انھیں موقع بہ موقع نصیحت کرتے رہتے کہ سلطنت کو شریعت اسلامیہ کی روشنی میں فروغ دیا جائے۔^(۹۷)

ہمایوں کی کش مشک

بابر کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ہمایوں اپنے تخت سلطنتی پر ۱۵۳۰ء میں بیٹھا، لیکن باپ کی طرح وہ کام یا ب حکم ران ثابت نہ ہو سکا۔ یقیناً اس نے کئی اہم جنگی معرکوں میں کامیابی حاصل کی، مگر اس کی عیش کوشی نے اسے ناکامی کی منزل پر پہنچا دیا اور شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھا کر در بہ در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوا اور کچھ دنوں تک سلطنت سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ ایران کے شاہ طهماشپ کی مدد سے دوبارہ ایک طاقت ور فوج جمع کر کے سب سے پہلے ان علاقوں کو اپنے بھائی سے چھیننا جن پر وہ قابض ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان پر حملہ کیا اور کام یابی سے ہم کنٹار ہوا۔ باوجود اس کام یابی کے وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہ کرسکا اور ایک دن وہ اپنے کتب خانے کے زینے سے گر کر ۱۵۵۶ھ / ۱۵۶۳ء میں موت کے آغوش میں چلا گیا۔^(۹۸) بدایوں نے لکھا ہے کہ ہمایوں کی تعلیم و تربیت مذہب و اخلاق کے اعتبار سے اعلیٰ قسم کی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صوم و صلوا کا بڑا پابند تھا۔ شریعت کے امور بہ حسن و خوبی انجام دیتا تھا، روزہ نماز کی ادائی میں کامیابی نہ کرتا، نہ تو وہ کبھی قسم کھاتا اور نہ ہی نوش الفاظ زبان پر لاتا، کسی سے کبھی ناراض ہوتا تو زیادہ سے زیادہ سفیہ کہ دیتا۔ معمولی احکام شرعی پر اس سختی سے عمل کرتا کہ مسجد میں کبھی پہلے بایاں پاؤں اندر نہ رکھتا، اور حسن ادب یہاں تک تھا کہ بے وضو خدا کا نام نہ لیتا۔^(۹۹) ایک دن اس نے میر عبد الحی کو عبدال کہہ

۹۵۔ بدایوں، منتخب التواریخ، ۱: ۳۲۳۔

۹۶۔ فرشتہ، تاریخ فرشتہ، ۱: ۲۰۸۔

۹۷۔ مکتوبات قدوسی، ۷، ۳۳۷، بہ حوالہ اعیاز الحجت قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیہ (lahor: اقبال اکادمی، ۱۹۸۲)، ۳۲۳۔

۹۸۔ فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۶۷۸۔

۹۹۔ بدایوں، مصدر سابق، ۱: ۳۶۸۔

کر خطاب کیا، پھر وضو کر کے اس نے کہا کہ میں تھا اور چوں کہ 'جی' نام خدا کا ہے اس لیے میں تمھیں تمھارے نام سے نہ پکار۔^(۱۰۰) اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک کثر سنسی حنفی بادشاہ تھا، مگر وہ اپنی سلطنت میں ہندو رعایا کی کسی بھی طرح کی دل آزاری کو ہرگز گوارانہ کرتا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ اس کا بھائی کھانے میں گائے کا گوشت زیادہ استعمال کرتا ہے، تو اس پر اس نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا: ”بد نصیب کامران! تیری تباہی کا باعث ہے کہ تو لذت طعام کے لیے گائوں کو ہلاک کرتا ہے، فرزندان بابر کے لیے گائے کے گوشت سے پرہیز لازم ہے۔ ہم چاروں کو وہی کرنا چاہیے جو ہمارے والد بزرگوار کرتے رہے ہیں۔ جب بھیڑیں اور بکریاں مل سکتی ہیں تو اس جانور کو کیوں ضائع کرتے ہو۔“^(۱۰۱)

اکبر کے مقضاد رنگ و روپ

جلال الدین اکبر نے جوانی کی دلیل پر قدم رکھ ہی رہا تھا کہ ہمایوں کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے ۱۵۵۶ھ/۱۶۰۳ء میں حکومت کی باغ ڈور اسے اپنے ہاتھوں میں لینی پڑی۔ کم سی کی بنا پر اتالیق بیرام خاں مقرر ہوئے۔ جیسے جیسے وہ جوانی کی منزیلیں عبور کر رہا تھا، اس کی قابلیت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسی سوچ بوجھ کا شرہ ہے کہ وہ لگ بھگ نصف صدی تک ہندوستان میں بلا شرکت غیر حکومت کر سکا۔ اس عرصے میں اس نے حکومت مغلیہ کو حد امکان تک وسیع کر دیا۔

جب ہم اکبر کی حکومت کی مدت کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی نصف حصے میں اس کی زندگی روشن اور صاف شفاف نظر آتی ہے، جس میں وہ دین و مذہب پر سختی سے عمل کرتا تھا اور شریعت کے چھوٹے چھوٹے حکم کو بڑی خوش اسلوبی سے بجالاتا تھا۔ ابوالفضل کے بقول شروع میں تو اس نے بعض ہندوؤں کو ڈرا دھمکا کر اپنے بزرگوں کے دین پر بھی لایا۔^(۱۰۲) مگر جب اس کی زندگی کے دوسرے نصف پر نظر جاتی ہے تو کم از کم دینی حیث رکھنے والے

۱۰۰۔ فرشتہ، مصدر سابق، ۱: ۲۷۹۔

۱۰۱۔ سالک، مسلم ثقافت ہندوستان میں، ۳۸۰۔

۱۰۲۔ تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کریں: بدیوانی، منتخب التواریخ، ۲۔ نیز ملاحظہ کریں راقم کا مضمون: ”دین الہی کا تحقیقی مطالعہ“، سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ (جو لائی۔ ستمبر ۲۰۰۵ء)۔

۱۰۳۔ ابوالفضل، اکبر نامہ (کلکتہ)، ۲: ۲۵۷۔

مسلمانوں کو افسوس کے ساتھ تجھ بھی ہوتا ہے، اس لیے آج تک اس کی زندگی متفاہ فیہ بنی ہوئی ہے۔^(۱۰۳) آخر اکبر کے اندر اتنا بڑا تغیر کیوں ہوا؟ اس گھرائی میں جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی اور مذہب سے انحراف کا ذمے دار وہ خود نہیں، بلکہ اس کے درباری علماتھے جو اپنے مفاد کے تحت دین کی من مانی تشریع و تعبیر کرتے۔ ایک عالم ایک وقت میں کسی چیز کو حلال اور شریعت کے عین مطابق قرار دیتا تو کوئی دوسرا عالم اس کے حرام ہونے کا فتویٰ داغنا تھا اور پھر اپنی بات کو منوانے کے لیے ایک دوسرے کی تضليل و تفحیک کرتا تھا۔ ان سب چیزوں کو دیکھ کر بادشاہ نہ صرف متھر ہوتا، بلکہ ایک دن وہ بھی آیا کہ اس نے یہ کہ کران علماء اپنا پیچھا چھڑالیا کہ یہ کیسے ممکن ہے ایک سچے مذہب میں اتنا تفہاد ہو۔ پھر جب اس نفرت کا اندازہ اس کی حرم کی ہندو رانیوں اور اس کے غیر مسلم احباب کو ہوا تو انھوں نے بادشاہ کو بہکار اسے دین اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات میں ڈال کر دین ہی سے برگشتہ کر دیا۔ ادھر پر تنگیوں نے بھی، جو دربار میں ایسے ہی موقع کی تلاش میں رہتے اور دین اسلام کی حقانیت اور اس کے اصول و ضوابط پر تنقید کرتے رہتے تھے، اسے اپنے حصار میں لینا شروع کر دیا۔ ان سب باوقوف کا اثر یہ ہوا کہ سلطنت میں کفر کو عروج حاصل ہوا اور اسلام کا زوال۔

اکبر کے متفاہ رنگ روپ کے باوجود اس پورے عہد میں اسلام مغلوب ہرگز نہیں ہوا اور جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ میرے خیال میں اس پورے عرصے میں یہاں اسلامی علوم کی نشوہ اشاعت کے تعلق سے جو وقوع کام ہوئے ہیں، تاریخ انھیں نہیں بھلا سکتی، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس کا اعتراف نہ کریں۔ اس نے فتح پور سیکری اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں بلا تفریق مذہب و ملت اپنی رعایا کی خوش حالی اور اس کی تعلیم و تربیت کے لیے جو مستحسن اقدامات کیے، ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے اثرات پورے ملک پر پڑے اور ہر جگہ تعلیمی ادارے قائم ہونے لگے۔ نیز بادشاہ کے حکم سے طریقۂ تدریس میں بھی تبدیلی کی گئی اور بچوں کو سائنسیک انداز سے

۱۰۳۔ تفصیلی مطالعے کے لیے ملاحظہ کریں: رقم کا مذکورہ بلا مضمون، نیز دیکھیں: بدایونی کی کتاب منتخب التواریخ، ج: ۲: اور ج: ۳: کے چیزہ چیزہ اوراق؛ مولوی محمد حسین آزاد، دربار اکبری (لکھنؤ: مکتبہ کلیاں)، لکھنؤ: سید میاں، علمائے ہند کا شاندار ماضی (دہلی: کتابستان)، ج: ۱۵: ۲۳، سید ابو الحسن علی ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، ج: ۲: ۱۰۷۔

پڑھانے کا رواج عام ہوا۔ اس کی وضاحت ابوالفضل نے آئین اکبری میں کی ہے۔ اس عہد کے علاوہ اور مشائخ بڑی صلاحیتوں اور خوبیوں کے مالک تھے۔

عہد جہانگیری میں مسلمانوں کی سر بلندی

جہانگیر نے ۱۶۰۵ء میں بادشاہ ہند بن کر دارالخلافۃ آگرہ کو رونق بخشی۔ سلیم کی تخت شینی سے راستہ العقیدہ مسلمانوں کو اس لیے خوشی ہوئی کہ وہ اپنے باپ کی طرح اسلام سے تنفر نہیں تھا، تاہم اس کے ابتدائی زمانہ حکومت میں اکبری عہد کے ہندوانہ رسوم و رواج کا زور ضرور رہا، مگر بہ تدریج اس میں کمی آتی گئی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ بادشاہ کے ارد گرد ایسے ایسے امرا جمع تھے جو حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات و ارشادات سے متأثر تھے۔ ایک دن وہ بھی آیا کہ بادشاہ خود حضرت مجدد کے معتقدین میں شامل ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اسلام کی حمایت میں ایسے بہت سے اقدام کیے، جن کا عہد شیخ احمد سرہندی نے بادشاہ سے لیا تھا۔^(۱۰۵)

جہانگیر کا باپ ترک اور ماں ہندو نژاد تھی۔ بھی وجہ ہے کہ وہ اپنے باپ کی طرح ہندوؤں پر بہت نوازش کرتا تھا، لیکن وہ اس بات کا ہرگز روادار نہیں تھا کہ کوئی ہندو تعصب کی بنا پر اسلام کی صداقت پر اعتراض اور مسلمانوں پر ظلم و زیادتی کرے۔ عہد اکبری میں ہندو اتنے نذر ہو گئے تھے کہ وہ جب اور جہاں چاہتے مسلمانوں کی مساجد و معابد پر حملہ کر دیتے اور شعائر اسلامی کے بجا لانے میں سد راہ ہوتے۔ یہاں تک کہ مسلمان عورتوں کو بھی زبردستی اپنے گھروں میں داخل کر لیتے تھے۔^(۱۰۶) دوسری طرف سیدھے سادے مسلمانوں نے ان سے میل جوں کی بنا پر بہت سے ہندوانہ طور طریقے بھی اپنالیے تھے۔^(۱۰۷) بادشاہ نے تمام چیزوں پر پابندی لگادی، مگر یہ کہنا کہ وہ متعصب تھا، سراسر غلط ہے۔ اگر اس نے اپنے عہد میں اسلام کے فروع کے لیے کچھ اپنے اقدامات کیے تو وہیں اس نے ہندوؤں کے ساتھ بھی نہایت مشفقاتہ بر تاؤ کیا۔ اس کا حکم تھا کہ کوئی مسلمان ہندوؤں کو زبردستی اسلام میں داخل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اس نے ہندوانہ رسماً ستر پر پابندی لگائی، تاکہ مرنے والے کے

۱۰۵۔ اکبر آبادی، مسلمانوں کا عروج و زوال، ۲۰۹۔

۱۰۶۔ مجدد الف ثانی، مکتبات امام ربانی، مکتبہ: ۹۱ (دہلی: اعتقاد پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء)، ۲: ۱۱۸۔

۱۰۷۔ ندوی، تاریخ دعوت و عزیمت، ۳: ۲۵۹-۲۶۱۔

بال بچوں کی زندگی تباہ و بر باد نہ ہو۔ اگر اس نے چند مندروں کو بہ تقاضائے مصلحت مسماں کیا تو اس کے عہد میں دوسری جگہوں پر بڑے بڑے منادر بھی تعمیر ہوئے۔ ثبوت کے لیے متحرکے قریب بندرا بن میں گوبند دیوی کے مندر کو پیش کیا جاسکتا ہے۔^(۱۰۸) اس عہد کا یہ بڑا الیہ ہے کہ شیعہ بڑی تعداد میں دربار سے منسلک تھے، خود بادشاہ کی بیوی نور جہاں شیعہ تھی، جس کے اثرات دربار میں بہت زیادہ تھے۔ ان لوگوں نے بھی اسلام کی بخش کرنی کے لیے ایسے ایسے اقدام کئے کہ اگر بادشاہ ذرا بھی دین سے غفلت بر تا تو اس زمانے میں اسلام کا وہی حال ہوتا جو اس کے باپ کے دور حکومت میں ہوا تھا۔

شah جہاں کی دین پروری

جہانگیر کے بعد اس کا بیٹا خرم شاہ جہاں ۷ اکتوبر ۱۶۲۷ء میں تخت سلطنتی پر رونق افروز ہوا۔ یہ نو عمری سے ہی بڑا راخ العقیدہ مسلمان تھا۔ اکبر اور جہانگیر کے بر عکس اس کے چہرے پر دلائلی بہار دکھار ہی تھی اور وہ ہمیشہ شراب نوشی سے محبت نہ رہا۔^(۱۰۹) نماز و روزہ کا پابند تھا اور تلاوت قرآن سے بڑا شغف رکھتا تھا۔^(۱۱۰) وہ علماء و فضلا کی بھی بڑی قدر کرتا تھا۔ اپنا زیادہ وقت ان کی صحبت میں گزارتا تھا۔ ملک ویرون ملک کے منتخب اور نمائندہ علماء دین کو اس نے اپنے دربا سے جوڑ لیا تھا۔ وہ حضرت مجدد سے بے انتہا عقیدت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے تخت نشینی کے بعد پہلے ہی فرمان میں باپ دادا کی رسم سے ہٹ کر سجدۃ تعظیمی کی ممانعت کر دی۔^(۱۱۱) اپنے چھٹے سال جلوس میں جو فرمان جاری کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہندوؤں کی خود سری پر بھی کاری ضرب لگائی۔^(۱۱۲)

اس عہد میں اسلام کو بہت عروج حاصل ہوا۔ اس نے متعدد مقامات کے ان مندروں کو مسماں کر دیا جو شاہی ممانعت کے باوجود تعمیر ہوئے تھے۔ اسی طرح بڑی تعداد میں ان ہندوؤں کو سزا دی جنھوں نے مسلمان عورتوں کو زبردستی اپنے حرم میں داخل کر لیا تھا۔^(۱۱۳) دلیپ نامی ایک ہندو کو اس نے اس لیے قتل کروایا کہ اس نے بچھے مسلمان عورتوں کا اغوا کر کے ان کے ساتھ غلط تعلق قائم کر لیا۔^{۱۰۸} مولوی ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان (علی گڑھ)، ۲: ۲۷۲۔

۱۰۹۔ عبد الحمید لاہوری، شاہ جہاں نامہ (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز)، ۱: ۵۹۔

۱۱۰۔ نفس مصدر، ۹۷-۹۳۔

۱۱۱۔ نفس مصدر، ۹۸۔

۱۱۲۔ نفس مصدر۔

۱۱۳۔ نفس مصدر۔

اس لیے قتل کروایا کہ اس نے بچھے مسلمان عورتوں کا انگو کر کے ان کے ساتھ غلط تعلق قائم کر لیا تھا، جس میں سے ایک نے بچہ بھی جنا تھا۔ پہلے بادشاہ نے اسے اسلام قبول کرنے کو کہا مگر اس نے اس سے انکار کر دیا۔^(۱۱۳) بادشاہ کے اس طرح کے اندامات سے ہندوؤں کی حوصلہ شکنی ہوئی اور مسلمانوں کو ان کے ظلم سے نجات ملی۔ نیز اس سزا سے بچنے کے لیے بہت سے ہندوؤں نے اسلام بھی قبول کیا جن کی تعلیم و تربیت کے لیے بادشاہ نے قاضی اور معلم مقرر کیے۔ بادشاہ کے زمانے کا یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ اس نے ہنگلی میں مقیم پرستگیزیوں پر متعدد بار حملہ کر کے انھیں یہاں سے نکالا۔ اسی طرح دکن کے اہل فرنگ کی بھی سخت گوش مالی کی۔^(۱۱۴) یہ لوگ اسلام کے لیے ایک بڑا خطرہ بننے ہوئے تھے اور مسلمانوں کا نہ صرف استہزا کرتے بلکہ موقع پا کر ان کا قتل بھی کر دیتے تھے، نیز مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر ان کی عورتوں کی عصمت پر حملہ کرتے۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ پہنچ کر عیسائیت کی تبلیغ کرتے۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ والی گول کنڈہ نے جمعہ کے خطبے سے خلافے راشدین کا نام نکال دیا ہے تو اس کے خلاف سخت فرمان صادر کیا اور حکم دیا کہ دوبارہ ان خلافے کے نام کو خطبے میں شامل کیا جائے۔ اسے نئی نئی عمدہ اور کشادہ عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے ہندوستان میں جو تعمیری یادگاریں چھوڑی ہیں، اس کی مثال نہیں ملتی، اور اس سے اس کی اسلامی حیثیت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔^(۱۱۵)

حاجی اسلام اور نگز زیب عالم گیر

حجی الدین اور نگز زیب عالم گیر ڈرامائی انداز سے شاہ جہاں کی موجودگی میں داراشکوہ کو شکست دینے کے بعد ۱۷۲۸ھ / ۱۷۶۸ء تخت مغلیہ پر جلوہ افروز ہوا۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال کی تھی۔ اگر وہ جوڑ توڑ کر کے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں نہ لیتا تو شاید اب بھی اسلام اور مسلمانوں کا وہی حشر ہوتا جیسا کہ عہد اکبری میں ہو چکا تھا یا بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے اتحاد کا شیرازہ بہت جلد بکھر جاتا، اس کی وجہ بتاتے ہوئے ایک مورخ گویا ہے:

۱۱۳۔ محمد صالح کمبوہ، عمل صالح (مکملہ: ۷۱۹۲: ۲)، ۲۳۶: ۲۔

۱۱۴۔ لاہوری، شاہ جہاں نامہ، ۱۷۶۲ء۔

۱۱۵۔ صولات، بیت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ۲: ۲۸۷-۲۹۰۔

دارالشکوہ میں حکومت کرنے کی صلاحیت بالکل نہ تھی، اس کے پرد جو بھی کام کیا جاتا وہ اس کو بگاڑ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ مذہبی عقائد بھی اس کے صحیح نہیں تھے۔ اس کا مزاج اور طبیعت اس معاملے میں اکبر سے ملتی جلتی تھی۔ اور نگ زیب کی طبیعت اس کے بالکل مخالف تھی۔ دارالشکوہ اگر بے دینی کی طرف مائل تھا تو اور نگ زیب دین دار تھا۔ دارالشکوہ حکومت کے معاملے میں جتنا اہل تھا، اور نگ زیب اتنا ہی اہل تھا۔ دونوں بھائیوں کی طبیعت اور مزاج کے اس فرق کی وجہ سے ایک دوسرے سے نفرت تھی۔^(۱۷)

اور نگ زیب عالم گیر بر صغیر کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اخلاق و عادات، محبت، دیانت، انصاف اور حکومت کی ذمے داری اور رعایا پروری میں بھی وہ بے مشل تھا۔ وہ سرکاری آمدنی کو اپنے ذاتی خرچ میں نہیں لاتا تھا، کیوں کہ اس کی نظر میں وہ رعایا کامال ہے اور اس سے جو رقم ٹیکس کی صورت میں وصول کی جائے اسے رعایا پر ہی خرچ کرنا چاہیے اور اسے اپنے ذاتی عیش و آرام اور مقربوں کی تعمیر پر خرچ کرنا بری بات ہے۔ خلفاء راشدین، نور الدین زنگی، صلاح الدین ایوبی اور خود ہندوستان میں ناصر الدین محمود کا یہی طریقہ تھا۔ اور نگ زیب نے بھی اس اعلیٰ مثال پر عمل کیا۔^(۱۸) اس سے بڑی بات ایک بادشاہ کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے تو پیوند لگا ہوا کپڑا پہننا تاکہ عوام پر اس کا بوجھ نہ پڑے جس نے سوکھی روٹی اس لیے کھائی کہ عوام کو دو وقت پیٹھ بھر کھانا نصیب ہو جائے۔ وہ اپنے گزارے کے لیے ٹوپی بتا اور قرآن کی کتابت کرتا تھا۔ بر نیر کا بیان ہے کہ بادشاہ رمضان کے مہینے میں روزہ افطار کرتا تو اس کے سامنے جوار اور مکتی کی روٹی ہوتی تھی۔^(۱۹) جب کہ مستعد خان نے تو یہاں تک لکھا ہے:

حضرت خلد مکانی (عالم گیر) اپنی فطرت سعادت اندوزی کی وجہ سے مذہبی معاملات کے بے حد پابند تھے۔ حنفی المذهب سنی تھے۔ اسلامی فرائض نہ سے کی سخت پابندی کرتے تھے۔ ہبیثہ باوضور رہتے اور کلمہ طیبہ اور دگر اوراد و وظائف کا ورد ہر وقت کرتے رہتے تھے۔ نماز باجماعت اول وقت میں ادا فرماتے اور تمام سنن و نوافل تک کو ادا کرتے تھے۔ ایام یہیں کے روزوں کے بڑے پابند تھے اور ہفتہ میں دوشنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ کو صائم رہتے۔ نماز جمع جامع مسجد میں ادا فرماتے۔ مقدس شب ہائے اسلامی میں رت جگا کر کے عبادت میں

-۱۱۷- صولات، نفس مرجع، ۲۹۷۔

-۱۱۸- سید صباح الدین، بزم تیموریہ، ۷۔ ۱۰۔

-۱۱۹- صولات، مرجع سابق، ۲: ۲۹۸۔

مشغول و مصروف رہتے۔ نماز کی پابندی کے علاوہ زکوٰۃ شرعی ادا کرنے کا بھی ایسا ہی اہتمام ہوتا تھا۔ ذاتی اخراجات کے لیے جو چند موضعات مخصوص کر لیے گئے تھے ان کی زکوٰۃ خود دیتے اور اولاد کو بھی خاص طور پر تاکید ہوتی تھی کہ زکوٰۃ پوری پابندی اور اہتمام کے ساتھ ادا کریں۔ ماہ صیام میں عبادت اور اوراد و وظائف میں اور زیادہ شدت ہو جاتی تھی۔ آخری عشرہ میں اعتکاف بھی کرتے۔^(۱۲۰)

عالم گیر علوم و فنون کا ایسا ماہر تھا کہ وہ تمام تیموری حکم رانوں پر بازی لے گیا۔ خود حافظ قرآن تھا، تفسیر، حدیث اور فقہ سے دل چپسی تھی، امام غزالی کی تصانیف اور دوسرے علماء کی کتابیں اکثر پڑھا کر تھا، فارسی شاعری کا اچھا مطالعہ تھا، عربی، فارسی، ترکی اور ہندی چاروں زبان سے خوب واقف تھا۔ فتاویٰ عالمگیری کی ترتیب تدوین اس کا شان دار علمی کارنامہ ہے۔^(۱۲۱) وہ حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے بے حد متأثر تھا اور خواجہ معصوم کا حد درجہ معتقد۔^(۱۲۲)

اصلاحات کے ضمن میں عالم گیر نے جو اہم کارنامے انجام دیے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بالعموم بادشاہ کے خاندان والے ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہوتے تھے، کوئی باز پرس نہیں ہوتی تھی۔ اور نگ زیب نے سختی سے روکا اور حکم دیا کہ کوئی بری نہیں ہو سکتا، سب کو برابر سزا ملے گی، اس کے جرم کے حساب سے۔ انصاف کے معاملے میں وہ اتنا سخت تھا کہ اس نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر بادشاہ وقت کے اندر بھی کسی طرح کی کوئی خائی نظر آئے تو عوام کو چاہیے کہ وہ عدالت میں مقدمہ چلائے۔ اس نے مجلس احتساب کا شعبہ قائم کر کے شراب خوری، ناچ، گانا اور طوالگوں کے دھنے کو بند کرا دیا۔ اسی طرح ہندو عورتوں کے لیے ستی کی ممانعت کر دی۔ بے شک اس نے کئی مندروں کو

-۱۲۰۔ محمد ساقی مستعد خاں، **ماہر عالم گیری** (کراچی: نیشنل آئیڈمی، ۱۹۶۲ء)، ۳۶۸۔

-۱۲۱۔ فتاویٰ عالم گیری /فتاویٰ ہندیہ کی اہمیت و فوائد کے لیے تفصیلی مطالعے کے ملاحظہ کریں راقم الحروف کا تحقیقی مقالہ ”فتاویٰ عالم گیری : تعارف اور مطالعہ‘، جو سے روزہ بین الاقوامی کافرنس (۱-۳ اگست ۲۰۰۹) اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان میں پڑھا گیا تھا۔ یہی مقالہ بعد میں فیکٹیو دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سالانہ مجلے دراسات دینیہ ۲۰۰۹ء میں ”فتاویٰ عالم گیری کی تدوین اور تحقیق“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے بعض دوسرے جرائد میں بھی اس کی اشاعت ہوئی۔

-۱۲۲۔ محمد اسلام، **تاریخی مقالات** (لاہور: ندوۃ المصنفین، ۱۹۷۰ء)، ۲۲۶۔ ۲۲۲؛ سید ابو الحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر (لکھنؤ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام)، ۳۷۵۔

منہدم کروایا۔ اس کے اصل اسباب و محکمات پر منصفانہ نظر دوڑانے کی ضرورت ہے۔ اگر اس نے مندروں کو مسمار کیا تو اس نے مسجدوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ جہاں اور جس جگہ فتنہ ساز لوگ ہوتے جو ملک اور سماج و معاشرہ میں فساد برپا کرتے اور رعایا کو پریشان کرتے وہ ان تمام جگہوں کا نام و نشان مٹا دینے کا روادر تھا۔

تاریخ ہند میں بالخصوص دو مسلم حکم رانوں کے انتقال پر نہ صرف مسلمانوں نے بلکہ ہندوؤں نے بھی گہرا سوگ منایا۔ ایک محمد بن قاسم کی موت پر اور دوسرے اورنگ زیب کی موت پر جمعہ ۳۲ فروری ۱۱۱۸ھ / ۷ مئی ۱۷۰۷ء میں جب اس کی لاش دفنانے کے لیے احمد نگر سے اورنگ آباد لے جائی جا رہی تھی تو راستہ بھر لوگ زار و قطار رو رہے تھے جیسے کہ وہ ان سب کا باپ تھا۔^(۱۲۲) اس کے انتقال کے بعد ملک کی سیاسی مذہبی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی صورت حال میں حد درجہ افراطی پیدا ہو گئی۔ اس سے پورے ملک کا نقشہ ہی بدل گیا اور مسلمانوں کا وقار و دیدبہ جاتا رہا۔ سید صباح الدین عبد الرحمن کے اس تجزیے میں صداقت ہے:

اورنگ زیب کی روح نفس عنصری سے پرواز ہوتے ہی تاریخ ہند کا رخ بدل گیا، ہمالیہ سے راس کماری تک پھیلی ہوئی سلطنت کے نظام کو قائم رکھنے کے لیے عالم گیر ہی کامل و دماغ چاہیے تھا، مگر حکومت بدلنے کے ساتھ زمانہ بدلنا اور تاریخ بھی بدل گئی۔ تخت طاؤس وہی تھا لیکن اس کے پروں کی خوش نمائی جاتی رہی۔ تیموری دربار وہی تھا لیکن اس کی رونق مث پچکی تھی۔ ارباب عقل و دانش بھی موجود تھے، مگر ان کی جو دن و غلطان اور سیاست سے فائدہ اٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ دیوان خاص کے کنگروں سے حضرت ویاس برنسے گئی۔ دیوان عام کی دیواروں پر افسردگی چھاگئی اور قلعہ محلی سو گوار ہو گیا۔ معلوم نہیں یہ کارکنان قضاو قدر کی مصلحت تھی یا عالم گیر کی اولاد کے اعمال کی پاداش۔ تیموری سلطنت اون کمال پر تھی۔ اس کے زوال کو روکنے کے لیے ایک آہنی قوت کی ضرورت تھی، مگر وہ قوت باقی نہ تھی۔ فطرت سرگرم کار ہوئی اور تیموری سلطنت کا وہی انجام ہوا جو روم، باہل اور نیبا کا ہو چکا تھا۔^(۱۲۳)

سلطنت مغلیہ کا زوال و انحطاط

مغل حکم ران اورنگ زیب عالم گیر کی وفات ۱۱۱۸ھ / ۷ مئی ۱۷۰۷ء کے بعد اس خاندان کے کئی حکم رانوں نے سلطنت مغلیہ کی باغ ڈور اپنے ہاتھ میں لی اور بارہ سالوں میں چھے مرتبہ تخت نشینی کے

- ۱۲۲ - صولت، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ۲: ۳۰۲۔

- ۱۲۳ - سید صباح الدین، بزم تیموریہ، ۳: ۹۶۔

لیے جنگیں ہوئیں۔ ان میں وہ قابلیت نہ تھی جو اورنگ زیب عالم گیر اور اس سے قبل تیموری حکم رانوں کے اندر تھی اور بے قول مولانا ابو الحسن علی ندوی:

اس کی اولاد میں وہ لوگ آئے جنہوں نے گویا قسم کھائی تھی کہ عالم گیر سے حمایت و حفاظت اسلام، احیاء دین اور اجراء سنت کی جو ”غلطی“ ہوئی تھی، وہ اس کی ملائی کریں گے، نیز اس سے سلطنت کے حدود میں جو توسعی کی تھی ہندوستان کے لظم و نق کو اپنی بیدار مغربی، مستعدی، اور فرض شناسی سے جو استحکام بخشت، عوام اور فتنہ پردازوں پر جو رعب و اثر قائم کیا تھا، وہ اپنی عیش پسندی، کابیلی و ناکابیلی، اندر و خارج احتلاف و کشمکش، خود غرض و جاہ پسند ارکان سلطنت و وزراء پر کلی اعتماد، اور امور سلطنت سے غفلت کے ذریعہ اس ”گناہ“ کا جو عالم گیر اعظم سے سرزد ہوا تھا مسلسل کفارہ ادا کرتے رہیں گے۔^(۱۲۵)

شاہ عالم اول (۱۱۱۸ھ / ۷۷۰ء - ۱۱۲۳ھ / ۷۷۱ء) عظیم الشان (۱۱۲۳ھ / ۷۷۱ء) جہاں دار

شاہ (۱۱۲۳ھ / ۷۷۱ء) فرخ شیر (۱۱۲۴ھ / ۷۷۱ء - ۱۱۲۵ھ / ۷۷۲ء) کے زمانے تک اگرچہ سلطنت میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں لیکن اس کے باوجود اس وقت تک مغولیہ سلطنت کے اثر اور اقتدار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ۷۷۱ء میں دکن کے صوبے دار حسین علی خاں نے مرہٹوں کو دکن کے چند صوبوں سے چوتھے اور سردیش کمکھی کے نام سے ٹیکیں وصولی کرنے کا حق اس شرط پر دے دیا کہ وہ سلطنت دہلی کی بالادستی کو تسلیم کریں گے۔ یہ حق تیموری سلطنت کے معاملات میں مرہٹوں کی مداخلت اور اس کے میدان کے طاقت پکڑنے کا باعث ہوا۔ ۱۱۲۴ھ / ۷۷۰ء میں بہادر شاہ کا پوتا محمد شاہ تخت نشیں ہوا، اس کی یہ تخت نشینی سلطنت تیموریہ کے زوال کا آغاز ہوا۔ اسی زمانے میں محمد شاہ رنگیلے کی عیش کوشی، ناکابیلی اور امرا کے باہم اختلافات اور تعصبات سے فائدہ اٹھا کر مہاراشر کے مرہٹوں نے زور پکڑا اور پانچ سال کے اندر اندر مہاراشر سے مالوہ تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا، یہاں تک کہ گجرات بھی مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا۔

محمد شاہ رنگیلے کی لاپرواہی اور ہٹ دھرمی سے برہم ہو کر نادر شاہ ایرانی نے ہندوستان کے ایک وسیع خطے کو دہلی سمیت تاراج کیا اور سلطنت دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس کے معاً بعد دکن، سندھ، بہگال، اودھ وغیرہ میں مستقل حکومتیں قائم ہو گئیں اور سلطنت مغلیہ سے تعلق ختم ہو گیا۔ ۷۷۵ء میں کشمير بھی بادشاہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ محمد شاہ کے جانشیں احمد شاہ (۱۱۶۱ھ / ۷۸۲ء -

۱۱۶۷ھ / ۱۷۵۲ء) اور عالم گیر ثانی (۱۱۶۸ھ / ۱۷۵۳ء - ۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء) بھی اس زوال کو نہ روک سکے۔ عالم گیر ثانی کے قتل کے بعد شاہ عالم ثانی (۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۹ء - ۱۱۲۱ھ / ۱۸۰۲ء) نے بادشاہت کا اعلان کیا۔ مگر اس نے بھی ایک دن رہ فرار اختیار کی اور اودھ پہنچ کر سانس لی۔ پھر انگریزوں کی پشت پناہی میں آگیا۔ اسی زمانے میں احمد شاہ عبدالی نے ہندوستان پر دوسرا بار حملہ کر کے مسلمانوں کی گرتی ہوئی طاقت کو سہارا دیا۔ اس کے باوجود وہ یہاں اپنی حکومت قائم کیے بغیر قدمدار لوٹ گیا، البتہ اس نے شاہ عالم کو تخت پر ضرور بٹھا دیا۔ اس کے بعد اکبر ثانی (۱۸۰۲ء - ۱۸۳۷ء) اور بہادر شاہ (۱۸۳۷ء - ۱۸۵۷ء) وغیرہ حکم ران ہوئے مگر یہ صرف برائے نام بادشاہ تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے وظیفہ خوار بن گئے، کیوں کہ اب ملک کے بیش تر حصوں پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ ان حکم رانوں کی سیاسی کم زوری، عیش و طرب کی زندگی اور دین سے غفلت مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ بی۔ ذیل کے اقتباس میں یہ صداقت جلوہ گر ہے:

اور نگ زیب عالم گیر کے جانشین سیاسی لحاظ سے کمزور، بزدل اور ناقابت انگلش، دینی لحاظ سے بے کردار اور آزاد، اخلاقی لحاظ سے عیاش واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے ان اصلاحات کو نہ صرف یہ کہ برقرار رہ کر، بلکہ پھر بد نظری، بے دینی اور بد اخلاقی کی فضا پیدا کر دی۔ کسی کے دینی عقائد متزلزل ہو گئے، تو کسی نے ڈمنی لال پر فریفہ ہو کر حکومت اس رقصاء کے حوالے کر دی۔ کسی نے بینا بازار کا اہتمام کیا، جہاں آتش شہوت کو ٹھینڈا کرنے کا انتظام تھا۔ کسی نے محمد حسین مشہدی کے نئے دین کی پشت پناہی کی۔ کسی نے شریعت محمدی پر نکتہ چینی کی اور مذہبی احکام کا مذاق اڑایا۔ کسی نے عیش و عشرت میں ڈوبے رہنے کو زندگی کی قیمت جانا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی گرفت ڈھیل پڑی تو طوائف الملوكی شروع ہوئی۔ غیر مسلموں نے موقع غنیمت جان کر صدیوں کا انتقام لھوں میں حاصل کرنے کا تھیہ کر لیا۔ اسلامی شعائر کمزور ہونے لگے اور کفر کے شعائر ظاہر ہونے لگے۔ بالآخر انگریزوں نے سازش اور چالاکی سے مسلمانوں کی طویل حکومت کا خاتمه کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان سے مسلمانوں کا اقبال بھی رخصت ہوا۔^(۱۲۶)

اور نگ زیب کے بعد سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے زمانہ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی علمی و روحانی، اخلاقی و معاشرتی، دینی و مذہبی حالت حد درجہ خراب ہو گئی تھی۔ لوگ عیش کوشی اور خرافات میں مبتلا ہو گئے تھے، توبہات اور مشرکانہ رسوم کا چلن ہو گیا تھا، پھر

- ۱۲۶ - محمد سعود عالم قاسمی، ”سلطین ہند اور اسلامی تہذیب“ سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، (اپریل-جون، ۱۹۹۳ء)۔

بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمان کلی طور پر اپنے دین سے بے خبر اور شعائرِ اسلامی کو بجالانے سے قاصر تھے۔ بلکہ ایسے وقت میں بھی خرایوں کے ساتھ بعض اچھائیاں بھی ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ میسویں صدی کے ایک عظیم مفکر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے بہ قول:

دین سے غفلت روز افزوں تھی مگر آنکھوں میں حیا اور دلوں میں گداز باقی تھا۔ اللہ کے نام کا ادب اور اس کی کہلانے والی چیزوں (شعائر اللہ) کا احترام رخصت نہیں ہوا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ توبہ و ابانت کی توفیق سلب نہیں ہوئی تھی۔ فتن و فجور میں ترقی تھی، مگر فتن و فجور پر اصرار اور معاصی و محربات کے اظہار و اعلان کا رواج نہیں ہوا تھا اہل دنیا کی وقعت اور اہل حکومت کا رعب ضرور تھا، مگر اہل دین کی تقدیر اور اہل علم کا اعزاز بھی قائم تھا اور دین کے ساتھ تمثیر و استہزا کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ مکومی و غلامی کے لیے تیاری شروع ہو گئی تھی، مگر اسلاف کی مردگانی و پسہ گری کا بجا کچھا سرمایہ باقی تھا۔ شجاعت و دلیری، وفاداری، وضع داری، چنگی، استقامت، عالی ہمتی، فراخ حوصلگی، جفاشی و مستعدی، جوہر شناسی، ذہانت و طباعی سے ابھی ہندوستانی مسلمانوں کا دامن خالی نہیں ہوا تھا۔ لیکن دین و علم کے یہ بڑے بڑے ذخیرے جو سلطنت کی کوششوں سے جمع ہوئے تھے مسلسل خرچ اور عرصے سے درآمد بند ہونے کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے ختم ہوتے جا رہے تھے اور اضافہ و ترقی کا دروازہ بند معلوم ہوتا تھا۔^(۱۲۷)

حاصل بحث

سابقہ بحث کی روشنی میں اگر سلطان محمود غزنوی سے لے کر بعد کے عہد میں سلاطین کی دینی مساعی کو دیکھا جائے تو انھیں حسب ذیل نکات میں سمیٹا جاسکتا ہے:

۱۔ اگر ہندوستان کا راجا جے پال سلطنت غزنی کو بے جا ہڑپنے کی کوشش نہ کرتا تو شاید محمود غزنوی ہندوستان کی جانب ابھی رخ نہ کرتا اور کرتا بھی تو بہت بعد میں، چنانچہ جب اس نے ہندوستان پر حملہ کی شروعات کیں تو پے درپے کئی حملے کیے اور تمام راجاؤں سے مقابلہ کر کے اس کی طاقت کو کم زور کر دیا جو بے پال یا اس کے بیٹے کا جنگ میں ساتھ دے رہے تھے، لیکن اس نے کہیں بھی جبرا و تشدد سے کام نہیں لیا۔ وہ اس قدر روادار واقع ہوا کہ جہاں بھی پہنچا اپنی کام یابی کے بعد عام اعلان کرتا کہ جس کا جی چاہے میری فوج میں داخل ہو جائے۔ جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں ہندو اس کی فوج میں شامل ہوئے۔ یہی وجہ ہے

۱۲۷۔ ابو الحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید (کراچی: مجلس تحقیقات نشریات اسلام، ۱۹۸۷ء)، ۱: ۸۱۔

کہ اس کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر کئی ہندو مقرر تھے۔ اس نے لگ بھگ پینتیس سال بڑی شان سے حکومت کی۔ پنجاب، ملتان، سندھ، گجرات، مالوہ، اجیر، دہلی، برلن، قون، میرٹھ، گوالیار، کالنجر وغیرہ کے علاقوں کو اپنے زیر نگمیں کیا اور جن سے سالانہ خراج وصول کرتا رہا۔ محمود ذہین، دین دار اور مخیر صاحب علم تھا۔ اس کے لیے مختلف فنون میں کتابیں تحریر کی گئیں اور مختلف ممالک کے علام اس کے دربار میں پہنچے جن کا وہ بڑا اکرام کرتا اور انعام سے نواز تھا۔ بڑا عادل، رعایا پرور اور ہمیشہ بر سر جہاد رہتا، جس کے لیے وہ مشہور ہے اور جس کے جنگی کارنامے تاریخوں میں مذکور ہیں۔ اس کے انتقال کے بعد تخت و تاج کے لیے بھائیوں میں جنگ شروع ہوتی، آخر مسعود غالب آیا، مگر وہ بھی زیادہ دنوں تک حکومت نہ کرسکا، پھر اس کا بھائی تخت پر بیٹھا، وہ بھی حکومت کو زوال سے نہ بچاسکا اور یکے بعد دیگر سے اس خاندان سے کئی حکم ران اٹھے جو نااہل ہی ثابت ہوئے۔ اس عرصے میں دوبارہ ہندوؤں نے سراٹھیا اور جن علاقوں پر محمود نے قبضہ کیا تھا وہ سب علاقے ان کی نگرانی سے نکل گئے۔ اسی کم نوری سے فائدہ اٹھا کر علاء الدین غوری نے غزنی پر حملہ کر کے اسے غور کی حکومت میں شامل کر لیا اور اسلام دشمن طاقت چاہے وہ یہاں کے ہندو ہوں یا ان کی پشت پناہی میں قرمطی، اس کی اچھی طرح سے گوش مالی کی۔ باوجود اس افراطی کے اس پورے عہد میں اسلام اور اسلامی علوم و فنون کو برابر ترقی ملتی رہی۔

۲۔ دہلی سلطنت بھی بڑی حد تک مہذب، فلاجی اور رعایا پرور کہی جاسکتی ہے۔ مطلق العنان بادشاہت کی جو خوبیاں ہو سکتی ہیں وہ اس میں تھیں اور ساتھ ہی کچھ کم زوریاں بھی تھیں، کیوں کہ وہ اپنے عہد کی گھری مذہبیت اور علام و مشائخ سے بہت قریب تھی اور خود کو خلافت کے نمونے سے کم از کم نظری اور ظاہری طور پر قریب رکھنے پر مجبور تھی۔ اس عہد کی ہیں الاقوامی سیاست میں بادشاہت کا ایک عام طرز و انداز تھا جس کے کم زور پہلوؤں سے مسلم بادشاہوں نے اپنے کو بلند رکھنے کی بہر حال کوشش کی۔ عدل و انصاف، علام پروری اور عوام کی راحت رسانی، تہذیب و تمدن کا فروغ، علوم و فنون کی ترقی، رفاه عام، بے تعصی و انسانی ہم دردی اور مذہب و اخلاق کی بالادستی کے لحاظ سے وہ آج کے جمہوری نظام سے بہت بلند تھی۔ بہر حال سلطنتیں دہلی اپنی مذہبیت و دینی روحانیات اور خدمت اسلام کے دعووں کے

باوجود اسلام کے مکمل نمائندے اور صحیح نمونہ نہیں کہے جاسکتے، اس لیے کہ ان کے قول و فعل کو اسلامی احکام کی پیروی نہیں قرار دیا جا سکتا، لیکن ان کا طرز عمل بڑی حد تک سیکولر تھا اور جہاں تک رموز مملکت اور طرز حکومت کا تعلق ہے، ان میں بیش تر سلاطین اسلام کی صحیح تعلیمات پر کم ہی عمل پیرا ہو سکے۔ اس بات کی سب سے بڑی دلیل ان کی مطلق العنان بادشاہت ہے، جو اسلامی نظریہ حکومت سے بہت دور ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ان میں سے شاید ہی کسی سلطان نے تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کی کوشش اس معنی میں کی ہو جس طرح علام و صوفیا کے طبقے نے انجام دی، البتہ ان کے رویے سے اس مبارک کام کو بڑی وسعت ملی، جس سے کسی بھی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تیموری حکم رانوں نے ہندوستان میں جس شان دار طریقے سے حکومت کی اس کی نظیر نہیں ملتی۔ بابر نے مختصر مدت میں ہندوستان کے باشندوں کے دلوں میں جو جگہ بنائی وہ تاریخ کا اہم باب ہے۔ اس نے ملک کو سجانے اور سنوار نے کی حد درجہ کوشش کی اور ہندو اور مسلمانوں کے قلوب کو جوڑنے کے لیے بھی مستحسن اقدامات کیے۔ اسی طرح اس کا بیٹا ہمایوں بھی کافی حد تک لاکن حکم ران ثابت ہوا جس نے اس ملک میں اسلامی قدرروں کو فروغ دیا۔

اکبر نے جتنی طویل مدت تک حکومت کی اگر اس کی فگر میں بعض وجوہ سے بے اعتدالی نہ ہوتی تو اس جیسی شان دار حکومت نہ اس سے قبل وجود میں آئی تھی اور نہ بعد میں کسی اور حکم راں کو نصیب ہوتی۔ لیکن اس کے متضاد رنگ روپ نے مسلمانوں کو کسی حد تک مقہور ہو کر کے رکھ دیا تھا۔ جہاں گیر بھی کسی قدر لاکن فرمان روا ثابت ہوا، مگر اسے اپنے باپ کے غلط رسوم و رواج کو مٹانے اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے ہی میں زیادہ وقت صرف ہوا۔ گو کہ اس نے آخری زمانے میں دینی جذبے کے تحت اسلام کو فروغ دینے کی کوشش ضرور کی۔ شاہ جہاں نے تو اپنی دینی حمیت کو پوری سلطنت میں عام کرنے کی بڑی کوشش کی۔

اور رنگ زیب عالم گیر نے بڑی جدوجہد کی کہ کسی طرح مسلمان اپنی شانخت کو قائم رکھے اور دینی و مذہبی قدرروں کا پاس کرے جس کے لیے اس نے کئی اچھے اقدامات کیے اور حکومت کو ہر قسم کے جھوٹ اور عیوب سے پاک رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے انتقال کے بعد حکومت

مغلیہ کا زوال شروع ہو گیا۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ عالم گیر کے بعد جو بھی حکم راں سامنے آئے ان کے اندر حکومت کرنے کی قابلیت نہ تھی۔ ان میں زیادہ تر عیش پرست اور خود غرض واقع ہوئے۔ اسی کم زوری سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا اور اور مغلیہ حکومت کا خاتمه کر کے اپنا اقتدار قائم کر لیا۔

علما، صوفیا اور مشائخ نے شروع سے کوشش کی کہ مسلم فرماداؤں کی سلطنت میں ایسے ہی امور انجام پائیں جن کا شریعت سے تعلق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات بادشاہوں سے بھی تعلق رکھتے اور رائھیں گاہے ہے گاہے ناصحانہ انداز میں اور کبھی سخت لمحے میں ان کی غلط کاریوں پر تنقید بھی کرتے رہے، جب کہ صوفیا کی جماعت ہمیشہ ان چیزوں سے دور رہی اور ایک گوشے میں بیٹھ کر قال اللہ و قال الرسول کی آواز بلند کی اور خلق کثیر کو اپنے واعظ و ارشاد سے متأثر کرتی رہی، جس کے نتیجے میں تبلیغ دین کا کام ہندوستان میں بڑے پیالے پر ہوا جس کا تاریخی روکارڈ موجود نہ ہونے کی بنا پر اس کا تعین نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ علام اور صوفیا جو حکومت وقت کے نگینے تھے اور جن کی مساعی سے بہت سے غیر مسلم حلقة اسلام میں داخل ہوئے۔

جب ہم ہندوستانی سماج و معاشرہ پر اسلام کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام نے اپنا اثر تو ضرور دکھایا اور اس کی صاف ستری تعلیمات نے غیر مسلموں کے دلوں میں بھی جگہ بنائی، مگر ان کی موثر تعلیم و تربیت کے فقدان کی وجہ سے یہ لوگ اسلام قبول کرنے سے پہلے اپنے سماج میں جس انداز سے زندگی بسر کر رہے تھے، اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے اندر کوئی بڑا تغیر نہ ہوا اور وہ اسی طور طریقے پر عامل رہے جو قبول اسلام سے قبل تھے، جس کا منفی اثر یہ ہوا کہ جب یہ لوگ مسلمان ہو کر مسلم معاشرہ میں داخل ہوئے اور ان کے ساتھ رہنے لگے تو دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو متأثر کیا۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں بہت ساری چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو ہندوانہ اور مشرکانہ ہیں اور جن کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان اپنا سب کچھ غیروں کو دیتے اور غیروں کی اچھی چیزوں کو قبول کرتے اور ان کے منفی رسوم و روایات اور عادات و اطوار سے ہرگز متأثر نہ ہوتے۔

-۸

جہاں تک مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور اسلامی علوم کے فروغ و اشاعت کا تعلق ہے تو یقیناً مسلمانوں نے ہندوستان میں اچھے نقش ثبت کیے ہیں اور علوم اسلامیہ کا کوئی ایسا ضروری گوشہ نہیں جس میں ہندوستانی علماء اہم خدمات انجام نہ دی ہوں۔ تفسیر، حدیث، فقہ کے علاوہ دوسرے علوم و فنون میں بھی انہوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں، ان سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ ان علوم و فنون کے فروغ و اشاعت کے لیے مسلمانوں نے جگہ جگہ مدارس و مکاتب قائم کیے جو حکومت کے اخراجات کے علاوہ امرا اور عام لوگوں کے بھی خرچ سے چلتے تھے۔ ان میں بھی بعض مدارس وہ ہیں جن کی تعمیر و ترقی میں خود بادشاہ وقت نے دل چپی لی اور علماء بھی اپنی ذمے داری سمجھ کر دینی علوم کے فروغ و اشاعت کے لیے مدرسے قائم کیے۔

